مسیحا
ایک انتہائی دلچسپ ناول
وکیل نجیب

مسیحا

(دکھوں سے نجات دلانے والا)

ایک انتہائی دلچسپ ناول

ہر عمر کے اُردو قارئین کے لیے

وکیل نجیب

پبلیشر

رحمانی پبلیکیشنز

1032، انصار روڈ، ڈاکٹر سراج احمد کے دواخانے کے سامنے، اسلام پورہ،
مالیگاؤں، مہاراشٹر Mob:9890801886 . 9270704505

نام کتاب : مسیحا (دکھوں سے نجات دلانے والا)

مصنف : وکیل نجیب

رہائش : نجیب منزل، نزد لال اسکول، مومن پورہ، ناگپور

Pin : 440018 / Mob:09373114213

صفحات : 112

تعداد : ایک ہزار

سن اشاعت : 2013ء

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد شاہد، حرا کمپوٹرس، مالیگاؤں

طباعت : شارپ آفسیٹ پریس، مالیگاؤں

قیمت : -/60

Novel MASIHA

Writer Wakeel Najeeb

Price Rs. 50/-

: Publisher :

Rahmani Publication

1032,Islampura, Malegaon-423203 (Dist-Nasik)

Mob:- 9890801886 / 9270704505

اِنتِساب

ممبئی کی نہایت فعال دینی اور
سماجی شخصیت، ہمدردِ قوم وملّت
پرنسپل سہیل لوکھنڈ والا صاحب
(سابق ایم۔ایل۔اے)
کی بے پناہ محبتوں کے نام

وکیل نجیب

تعارف مصنّف

نام	:	عبدالوکیل
قلمی نام	:	وکیل نجیب
والد کا نام	:	نجیب اللہ مقادم مرحوم
پیدائش	:	یکم جولائی ۱۹۴۶ء
تعلیم	:	ایم۔اے، بی۔ایڈ
پیشہ	:	ادبی وسماجی خدمت
شوق	:	لکھنا پڑھنا

مصروفیات......

- سابق پرنسپل اسلامیہ جونیئر کالج آف سائنس، مومن پورہ، ناگپور
- چیئرمین نجیب ہاؤسنگ ڈیولپمنٹ کارپوریشن، ناگپور
- صدر آشیرواد ہاؤسنگ سوسائٹی، ناگپور
- چیئرمین تکیہ محبوب شاہ میدان ایکشن کمیٹی، مومن پورہ، ناگپور
- صدر حضرت بابا شہاب الدین درگارہ کمیٹی، مومن پورہ، ناگپور
- صدر مدرسۂ یعقوبیہ کمیٹی، مومن پورہ، ناگپور
- سکریٹری انجمن اصلاح الطلباء، مومن پورہ، ناگپور
- سکریٹری صدیق استاد لائبریری، مومن پورہ، ناگپور
- سرپرست "بزم اطفال و گلشن اطفال" مالیگاؤں

اعزازات......

- معمارادب — منجانب عادل علی مرکز، کامٹی
- سفیرِادب — منجانب گلشنِ اطفال کمیٹی، مالیگاؤں
- شانِ ملّت — منجانب محسن ملّت کمیٹی، مومن پورہ، ناگپور
- ندائے ملّت — منجانب تکیہ محبوب شاہ ایکشن کمیٹی، مومن پورہ ناگپور

ایوارڈ......

- جنگل کی امانت — مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی، ممبئی
- مہربان جن — مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی، یوپی اُردو اکیڈمی، لکھنؤ
- واپسی — مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی، ممبئی
- کمپیوٹان — مغربی بنگال اُردو اکاڈمی، کولکاتا
- بزمِ اطفال ایوارڈ
- وِدربھ مسلم گورو پرسکار، شاداب ایجوکیشن سوسائٹی، ناگپور
- ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل نیشنل ایوارڈ 2009
- صدیق اختر میموریل ایوارڈ، کامٹی
- اسباق ایوارڈ، پونے
- الہدیٰ سماج رتن ایوارڈ، شندورنی
- لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، ممبئی

فہرست تصانیف:

نمبر شمار	نام تصانیف	صنف	طباعت
۱۔	بے زبان ساتھی	ناول	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی
۲۔	جنگل کی امانت	کہانیوں کا مجموعہ	مالی تعاون، فخرالدین احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ
۳۔	مہربان جن	ناول	دہلی اُردو اکادمی، نئی دہلی، رحمانی پبلی کیشنز
۴۔	خوفناک حویلی	ناول	ماہنامہ امنگ، نئی دہلی، رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۵۔	خطرناک راستے	ناول	ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی
۶۔	جانباز ساتھی	ناول	ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی
۷۔	غدار وزیر	ناول	ماہنامہ امنگ، نئی دہلی، رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۸۔	جانباز شہزادے	ناول	نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی
۹۔	پانچ بھائی	ناول	نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی
۱۰۔	واپسی	ناولٹ	ماہنامہ ہلال، رامپور + رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۱۱۔	سنگریزے	افسانوں کا مجموعہ	نجیب پبلی کیشنز، مومن پورہ، ناگپور
۱۲۔	شمالی ہندوستان کے چند خوبصورت مقامات کی سیر	سفرنامہ	نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی؛ ماہنامہ نور، رام پور، انقلاب، ممبئی
۱۳۔	انوکھی دوا	ناول	بزمِ اطفال و گلشنِ اطفال، مالیگاؤں

۱۴۔	سازش	ناول	قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی۔
۱۵۔	کمپیوٹان	ناول	نرالی دنیا پبلی کیشنز+رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں+ NCPUL نئی دہلی
۱۶۔	ایک عجیب حادثہ	ناول	قسط وار اشاعت ماہنامہ گل بوٹے، ممبئی
۱۷۔	ماں کی بددعا	کہانیوں کا مجموعہ	رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۱۸۔	نواب بنڈی والا	ناول	رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۱۹۔	سفرنامہ حج وزیارت مدینہ منورہ ۲۰۰۶ء	سفرنامہ	رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۲۰۔	انسانیت اور درندگی	ناول	رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۲۱۔	سیاہ رات	ناول	رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۲۲۔	معصوم بجوکا	ناول	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
۲۳۔	اپنا دکھ اپنی خوشی	ڈرامے	رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۲۴۔	اندھیرا اجالا	کہانیوں کا مجموعہ	رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۲۵۔	کچھ ڈرامے، کچھ کہانیاں		قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
۲۶۔	ایک شخصیت پانچ کہانیاں	کہانیاں	رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۲۷۔	غمگسار	ناول	رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں
۲۸۔	مسیحا	ناول	رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

میرا نیا ناول ''مسیحا'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ گذشتہ دنوں ممبئی میں میرے نئے ناول ''غمگسار'' کا اجراء عمل میں آیا جس کا انعقاد جناب رمضان علی سحر صاحب کی کوششوں سے ہو پایا، اس میں اشتیاق سعید صاحب نے کافی محنت کی۔ جناب فاروق سید اور اقبال نیازی صاحب نے اس پروگرام کی تشہیر اور کامیاب بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ محترم پرنسپل سہیل لوکھنڈوالا صاحب کے دست مبارک سے اس کا اجرا ہوا اور جناب ضمیر کاظمی صاحب نے اس کی صدارت کی۔ رانچی سے ایم اے حق صاحب نے بطور مہمان خصوصی اس میں شرکت کی۔ پروفیسر کلیم ضیاء صاحب نے اس پروگرام کی نظامت کی۔ جلسے میں بہت سی علمی و ادبی شخصیتوں نے شرکت کی۔ اسی طرح ۱۵ر دسمبر ۲۰۱۲ء کے کوئز کانٹیسٹ کے سالانہ مقابلے میں جناب سہیل لوکھنڈوالا صاحب کی جانب سے جلسے میں میرا استقبال ہوا۔ مجھے ادبِ اطفال کے لئے لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ اور شاندار ٹرافی دی گئی اور ۲۵ر ہزار روپے نقد نذرانہ دیا گیا۔ مجھے حاصل ہونے والا یہ اب تک کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

ان سارے لوگوں کی محبتوں کو میں دل سے سلام کرتا ہوں۔ ادب اطفال کی وجہ سے آج میں پورے ملک میں جانا پہچانا جاتا ہوں۔ یہ میرے

لئے فخر کی بات ہے۔

ناگپور سے ڈاکٹر شرف الدین ساحل صاحب، پرنسپل حاجی محمد ابوالکلام صاحب اور قرطاس کے مدیر الحاج محمد امین الدین صاحب غمگسار کے اجراء کے پروگرام میں میرے ساتھ ممبئی گئے، پروگرام میں ان حضرات نے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ یہاں شہر میں بھی میرے ادبی کاموں کو دل سے سراہتے رہتے ہیں میں ان کا مشکور ہوں۔

حقیقت کا اظہار بڑا مشکل کام ہے۔ اس ناول میں میں نے یہ کام انجام دینے کی امکانی کوشش کی ہے۔ ''مسیحا'' جلدی میں لکھا ہوا ایک مختصر ناول ہے لیکن کہانی کا بہاؤ کافی تیز ہے۔ اس میں تجسس کی کافی لہریں اٹھتی اور معدوم ہوتی رہتی ہیں۔ جو قاری کو باندھے رکھے گی۔ میرے اس ناول ''مسیحا'' کو ڈاکٹر شرف الدین ساحل صاحب اور محمد امین الدین صاحب نے ایک سے زائد بار پڑھا۔ مجھے مفید مشورے دیئے۔

جناب مراق مرزا صاحب (ممبئی) اور جناب ایم مبین صاحب (بھیونڈی) نے میرے ناول کے مسودے کو بغور پڑھا اور اپنے تاثرات لکھ کر مجھے روانہ کئے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ میں ان چاروں حضرات کا دل سے شکرگزار ہوں۔

اس ناول کے مسودے کی نوک پلک سنوارنے میں ڈاکٹر شرف الدین ساحل کے فرزند عزیزم محمد رفیع الدین ناگپور نے بھی کافی وقت صرف کیا ہے اور کافی محنت کی ہے وہ بھی میرے شکریہ کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ ناول کافی مقبولیت حاصل کرے گا۔ کافی پسند کیا جائے گا لیکن مستقبل کو کس نے دیکھا ہے۔ قارئین کی آراء اور دعاؤں کا منتظر ہوں۔

وکیل نجیب

ایک ذمہ دار قلمکار: وکیل نجیب

گزشتہ قریب دو دہائیوں کے دوران ہندوستان میں اردو کے ادبی افق پر بحیثیت "بچوں کا ادیب" جو ایک فنکار تیز رفتاری سے ابھرا ہے، اسے ہم وکیل نجیب کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ وکیل نجیب کا قلم نہایت طمطراق کے ساتھ بلا تعطل رواں دواں ہے اور وہ بچوں کے لیے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ افسانوں اور کہانیوں کی کئی کتابوں کے علاوہ متعدد ناول و ناولٹ بھی موصوف کے زورِ قلم کے نتیجے میں منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور طفلی قارئین کے ساتھ ساتھ پختہ عمر کے ادب پسند Readers کا دل بھی جیت چکے ہیں۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ کئی علمی و ادبی اداروں نے وکیل نجیب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں انعام و اعزاز سے بھی نوازا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عصرِ حاضر کے ادبی منظر نامہ میں محترم وکیل نجیب ادبِ اطفال کے حوالے سے اپنی ایک مضبوط و مستحکم شناخت قائم کر چکے ہیں۔ وسیلۂ قلم سے ربِ کائنات نے انھیں جو شہرت و مقبولیت عطا کی ہے، میں سمجھتا ہوں وہ جائز طور پر اس کے حقدار بھی ہیں کیوں کہ وہ اپنا تخلیقی کام بے حد ایمانداری اور دیانت داری سے انجام دے رہے ہیں۔ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ وہ پیشۂ درس و تدریس

سے وابستہ رہ کر گزار چکے ہیں لہٰذا علم کی اہمیت و استفادیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور کہانی یا افسانہ لکھتے وقت قلم کی ذمہ داری کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

وکیل نجیب کی قلمکاری و فنکاری کی ایک اہم اور امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے افسانے، کہانیاں نیز ناول وناولٹ بچوں کے ساتھ ساتھ پختہ اذہان قارئین کو بھی یکساں طور پر پسند آتے ہیں، جس کے باعث وہ نہ صرف بچوں کے بلکہ بڑی عمر کے قارئین کے بھی پسندیدہ ادیب بن چکے ہیں۔ سماجی و سیاسی مسئلہ مسائل کے علاوہ سائنسی علوم کو بھی اپنے دائرۂ تخلیق میں لاکر عمدہ اور تحیر سے لبریز کہانیاں لکھنے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ موضوعات کی مقصدیت و معنویت نیز عصری حسیت بھی ان کے افسانے و کہانی میں نمایاں طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ تفریحی عناصر کے ہمراہ وہ اپنی کہانیوں کو کچھ سبق اور نصیحت کے گل بوٹوں سے بھی آراستہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔

چند برس قبل وکیل نجیب کے تخلیقی سفر میں ایک **Transition** بھی آیا ہے۔ انھوں نے چند کہانیاں بڑی عمر کے بالغ نظر قارئین کے لیے تحریر کی ہیں اور ان کی یہ کاوش بھی بفضل ربی کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے۔ ان کا ایک ناول ''سیاہ رات'' فکر انگیز سرنامے کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ یہ ناول میرے مطالعے سے بھی گزرا ہے۔ اس ناول کی تخلیق میں وہ ناول نگاری کے تمام فنی اور **Creative** لوازمات کو پورا کرتے ہوئے ایک روشن فکر مشاق ناول نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے ابھرتے ہیں۔ ان کی تخلیقی راہ گزر میں یہ ایک فطری بدلاؤ ہے جو کبھی کبھی ایک ہی موضوع پر بہت زیادہ لکھتے رہنے کے

باعث ازخود وجود میں آتا ہے۔کوئی فنکار اس کے لیے شعوری طور پر
کوشش نہیں کرتا۔ یہ Transition عالمی ادب کے کئی بڑے
قلمکاروں کے یہاں بھی ملتا ہے۔

''مسیحا'' یعنی دکھوں سے نجات دلانے والا...... وکیل نجیب کا
تازہ ناول ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر عمر کے قاری کے لیے
ہے۔ اس ناول کا مرکزی خیال بھی وکیل نجیب کے گزشتہ ناولوں کی
طرح بے حد دلچسپ ہے۔ صفحہ اول تا آخر یہ ناول قاری کو اپنی گرفت
میں رکھنے کی بھرپور قوت رکھتا ہے۔

یقین ہے کہ وکیل نجیب کی یہ تخلیق بھی حسب سابق اپنے قارئین
کے توقعات پر پوری اترے گی۔ ''مسیحا'' کی اشاعت پر میں انھیں
پرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مراق مرزا
سی ۲/۳، یونٹی کامپلکس سی ایچ ایس
یاری روڈ، ورسوا، اندھیری (ویسٹ)
ممبئی ۶۱/

وکیل نجیب کی مسیحائی

اس بات کا اعتراف بڑے بڑے ادیبوں نے کیا ہے کہ جتنا بڑوں کے لیے لکھنا آسان ہے بچوں کے لیے لکھنا اتنا ہی مشکل ہے۔ بڑوں کے لیے انھوں نے سینکڑوں کتابیں لکھ ڈالی ہوں گی لیکن چاہ کر بھی بچوں کے لیے لکھ نہیں پاتے ہیں۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب اطفال ایک ایسی صنف ہے جو ہر کسی کے بس میں نہیں اور ان لوگوں کو منہ توڑ جواب ہے جو بچوں کے ادب کو بچکانہ ادب کہتے ہیں اور بچوں کے لیے ایک صفحہ بھی لکھ نہیں پاتے۔

ایسے میں وکیل نجیب جیسے ادیبوں پر آفرین ہے جو فخر سے اپنے آپ کو "ادیب اطفال" کہتے ہیں اور "ادیب اطفال" کہنے میں نہ صرف فخر کرتے ہیں بلکہ انھوں نے اپنی زندگی "ادب اطفال" کی تخلیق کے لیے وقف کر دی ہے اور بچوں کے ادب میں بے شمار کتابوں کا اضافہ کیا ہے، کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ آج بھی ایسے بہت سے ادیب ہیں جن کی کتابوں کا انتظار قارئین کو رہتا ہے۔ ان خوش نصیب ادیبوں میں سے وکیل نجیب بھی ہیں۔ وکیل نجیب ایک ایسے قلمکار ہیں جن کی تحریروں کا قارئین کو انتظار رہتا ہے۔ ان میں ایک میں بھی شامل ہوں۔

جب بھی وکیل نجیب کی کوئی تخلیق میرے ہاتھ آتی ہے نہ صرف میں اسے شوق سے پڑھتا ہوں بلکہ اس کو ایک ہی نشست میں ختم بھی کر دیتا ہوں۔ ان کی تخلیقات بھلے ہی وہ "کمپیوٹان" اور "سیاہ رات" جیسے ضخیم ناول ہی کیوں نہ ہو اگر میں ایک ہی نشست میں ختم

کر دیتا ہوں تو اس میں میرے شوق مطالعہ کا دخل کم ہوتا ہے جبکہ وکیل نجیب صاحب کی تحریروں کی گرفت زیادہ ہوتی ہے۔ان کی تحریروں میں جو روانی ہوتی ہے اور ان کے پاس جو قارئین کو باندھ کر رکھنے کا ہنر ہے میں اس کا اسیر ہو جاتا ہوں اور ان کی کتابیں ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالتا ہوں۔

ان کا نیا ناول ''مسیحا'' جب میرے ہاتھ آیا تو یہ بھی میرے لیے ایک اسیری کا پیغام لے کر آیا۔ناول کے ہاتھ میں آتے ہی پہلی سطر پڑھتے ہی میں اس کا اسیر ہو گیا اور مجھے اس اسیری سے نجات اس وقت ملی جب میں نے ناول کی آخری سطر پڑھی۔

دیگر ناولوں کے مقابلہ وکیل نجیب صاحب کا یہ ناول کافی چھوٹا ہے لیکن اس ناول کو پڑھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اتنے اچھے اور بڑے پلاٹ کو وکیل نجیب صاحب نے بہت کم صفحات میں سمیٹ دیا۔اگر وہ چاہتے تو اس پر بھی کمپیوٹان، سیاہ رات یا غمگسار جیسا ضخیم ناول لکھ سکتے تھے۔اس ناول کو بھی سسپنس تھریلر کا نام دوں گا۔

اس ناول میں سسپنس بھی ہے اور تھریلر بھی۔تھریلروں کی طرح اس ناول میں مار دھاڑ یا پھر مہمات تو نہیں ہے لیکن وکیل نجیب نے اس ناول میں ناول کے پلاٹ کی مناسبت سے جو واقعات پیش کئے ہیں اور ان کو جس طرح ایک دوسرے سے مربوط کیا ہے یہ کسی تھریلر کا ہی لطف دیتے ہیں۔

ناول کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ناول کے راوی جو اتفاق سے خود وکیل نجیب ہی ہیں کے پاس دہلی سے ایک لڑکا آتا ہے۔وہ مصنف وکیل نجیب صاحب کو اپنی پریشانیاں بتاتا ہے۔مصنف اسے پریشانیوں سے نجات دلانے میں خود بہت سی پریشانیوں میں گھر جاتا ہے۔اس کے بعد ناول میں الجھنیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔قاری جن کے سحر سے نکلنے نہیں پاتا اور وکیل نجیب کی داستان گوئی کے سحر میں ڈوب سا جاتا ہے۔پورے ناول پر تجسس کی فضا سی بنی گئی ہے اور قارئین کے لیے وکیل نجیب صاحب نے جیسے ہر ہر سطر میں ایک نیا تجسس بن دیا ہے اور وہ ناول کی اگلی سطر، پیراگراف اور صفحہ پڑھنے کے لیے بیتاب رہتا ہے اور ناول کے آخر میں وہ چونک پڑتا ہے۔

وکیل نجیب نے ناول کا اختتام اتنے ڈرامائی انداز میں کیا ہے کہ اس کو ختم کرنے کے بعد قارئین کے ذہن میں ناول کا ایک ایک واقعہ گھومنے لگتا ہے۔ وہ بھی ان واقعات کی لڑیاں ایک دوسرے سے ملا کر ان کو ناول کے اختتام کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وکیل نجیب نے ناول کے اختتام میں جو بات کہی ہے اس کی روشنی میں ناول اور اس میں بیان کردہ واقعات کے تمام میزان بدل سے جاتے ہیں اور وہ ایک نئے میزان کی بنیاد پر سوچنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا کبھی ایسا ہوا ہوگا؟ اور وہ انہی سوالوں میں الجھا رہتا ہے اور عرصہ تک وہ ناول کے سحر سے باہر نکل نہیں پاتا ہے۔

ناول کا نام ''مسیحا'' ہے جو ناول کے مرکزی کردار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن ناول پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ناول کا ''مسیحا'' ناول کا مرکزی کردار تفضل کریم نہیں ہے بلکہ ناول کے راوی وکیل نجیب خود ہیں کیونکہ انھوں نے پورے ناول میں نہ صرف مرکزی کردار کی مدد کی ہے بلکہ اُس کو مشکلات سے نکالنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اس لیے یہ عنوان ناول کے مرکزی کردار پر نہ فٹ ہو کے ناول کے راوی پر فٹ ہوتا ہے۔

بحرحال یہ وکیل نجیب کے دیگر ناولوں کی طرح ایک دلچسپ ناول ہے۔ جس کو قارئین ایک بار پڑھنا شروع کریں گے تو ایک ہی نشست میں ختم کر دیں گے۔

ایم مبین
۳۰۳ / کلاسک پلازا، تین بتی،
بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲ (ضلع تھانہ)

مسیحا

(دکھوں سے نجات دلانے والا)

مسیحا
(دکھوں سے نجات دلانے والا)

یہ واقعہ جو آج میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں دس سال پہلے کا ہے۔ آج بھی جب یہ باتیں یاد آتی ہیں تو میں خیالات میں گم ہو جاتا ہوں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ کیا واقعی یہ سب کچھ حقیقت میں واقع ہوا تھا۔ کیا کسی کے ساتھ ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ کہیں یہ کوئی خوفناک خواب تو نہیں تھا جسے میں نے دیکھا اور جو میری زندگی کو، میرے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر چلا گیا۔ لیکن سچائی کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ یہ سارے عجیب اور حیرت انگیز واقعات حقیقت میں میرے ساتھ پیش آئے ہیں جنھیں میں آج بیان کرنے جا رہا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ 25 اپریل 2002ء کی بات ہے۔ صبح کے ۹ بجے تھے۔ میں صبح کے اخبار میں گجرات میں ہونے والے فسادات پر ایک مضمون پڑھ رہا تھا جس میں وہاں مسلمانوں پر کیے گئے ظلم و ستم کی ہیبتناک داستان بیان کی گئی تھی جسے پڑھ کر کلیجے پر گھونسے برستے محسوس ہوتے تھے اور اخبار میں چھپی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر دل چھلنی ہوا جاتا تھا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ پیٹھ پر اس کے ایک بیگ تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کسی لمبے سفر سے آیا ہے۔ لڑکا بہت ہی دلکش نقوش والا، صحت مند اور خوبصورت تھا۔ لڑکے نے مجھے سلام کیا، میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا: ''کس سے ملنا ہے؟ کہاں سے آ رہے ہو؟''

لڑکے نے کہا: ''میں دلّی سے آ رہا ہوں۔ مجھے وکیل نجیب صاحب سے ملنا ہے۔''

میں نے کہا: ''اچھا، آؤ اندر آؤ۔'' اس نے اپنے نئے طرز کے لیس والے جوتے دروازے پر اتار دیئے اور اندر آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے بیٹے نعمل الوکیل کو آواز دی اور اسے پانی لانے کو کہا۔ لڑکے نے پانی پی لیا تو میں نے اس سے کہا:

''ہاں تو میرے پاس کس کام سے آئے ہو۔''

اس نے کہا: ''انکل مجھے ڈاکٹر خوشحال زیدی صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے یہ ان کا خط ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنی جیب سے خط نکالا اور مجھے دے دیا۔ میں نے خط کھول کر دیکھا اس میں زیدی صاحب نے لکھا تھا کہ یہ لڑکا فیملی کے انتہائی پیچیدہ معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ اس کی جو مدد کر سکتے ہو کرو۔''

میں نے لڑکے سے کہا کہ وہ اپنا بیگ اتار کر رکھ دے اور اندر جا کر منہ ہاتھ دھولے۔ اس نے اپنا بیگ اتار کر ٹی ٹیبل پر رکھ دیا۔ میں نے اپنے بیٹے کے ساتھ اسے اندر باتھ روم میں بھجوا دیا۔ لڑکا تھوڑی ہی دیر میں آ گیا۔ اب وہ کافی نکھرا ہوا تر و تازہ لگ رہا تھا۔ عجیب طرح کی دلکشی اس کے چہرے پر تھی جہاں سے نگاہیں ہٹتی نہ تھیں۔ پھر سے میرے پاس کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ ناشتہ کیا اور اس سے کہا: ''دیکھو اب اطمینان سے مجھے بتاؤ کہ تم کس سلسلے میں اتنی دور سے یہاں میرے پاس آئے ہو۔''

میری بات سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور کہا: ''حوصلہ رکھو ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل نکل آتا ہے، بتاؤ تمہاری پریشانی کیا ہے؟''

لڑکے نے تھوڑی دیر میں اپنے اوپر قابو پالیا اور پھر مجھ سے یوں گویا ہوا: ''انکل میرا نام تفضّل کریم ہے۔ ہم بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں اگر ہم اس سے نہیں نکل پائے تو ہم لوگ فٹ پاتھ پر آ جائیں گے اور میری والدہ خودکشی کر لیں گی۔''

میں نے کہا: ''تم مجھے ساری باتیں تفصیل سے بتاؤ۔ تمہارا گھر دہلی میں ہے میں یہاں ناگپور میں رہتا ہوں۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں جبکہ نہ تو میں تمہیں جانتا پہچانتا ہوں نہ ہی تمہارے گھر کے کسی فرد سے واقف ہوں۔''

لڑکے نے کہا: ''یہ جو ہماری بربادی کی داستان ہے اس کا ناگپور میں ہی پتہ چل

سکتا ہے اور اسی لئے ڈاکٹر خوشحال زیدی صاحب سے مشورہ کر کے میں یہاں آیا ہوں۔"

"ڈاکٹر خوشحال زیدی تمہارے کون ہوتے ہیں؟"

"جی ان سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ میرے دادا جان کے بہت ہی قریبی دوست ہیں۔"

"اور تمہارے دادا جان؟"

"میرے دادا جان دلّی کے ایک نوابی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مٹیا محل میں ہماری پرانی کوٹھی ہے۔ انہیں اردو ادب سے بہت دلچسپی تھی اسی وجہ سے ڈاکٹر خوشحال زیدی صاحب سے ان کے مراسم تھے۔"

"ابھی تمہارے دادا جان کا کیا حال ہے؟"

"جی، پندرہ بیس دن پہلے ان کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"اوہ کیسے؟"

"بیمار تھے۔ ایک صبح لوگوں نے اٹھ کر ان کے کمرے میں دیکھا، وہ مرے پڑے ہوئے تھے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ ابھی میں یہاں ناگپور میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"دراصل میرے دادا نے اپنی شاعری اور نثری مضامین کو بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ پورا سرمایہ ان کی اپنی ہاتھ کی لکھائی میں تھا۔ ایک بار انھوں نے سارے مسودے دکھا کر مجھ سے کہا تھا کہ اگر زندگی میں تجھ پر کبھی کوئی بہت بڑی مصیبت آئے تو ان مسودوں کو غور سے پڑھنا۔ ان میں ایسے اشارے ملیں گے کہ تیری پریشانی دور ہو جائے گی۔"

"پھر؟ اب کیا تکلیف ہے۔ انہیں پڑھو اور اپنی پریشانی دور کرلو۔"

لڑکے نے کہا: ''میں پنج گنی کے رہائشی اسکول میں نویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ دادا کے انتقال کی خبر مجھے ملی تو ہمارے امتحانات چل رہے تھے۔ مجھے چھٹی نہیں ملی۔ تین دن بعد میں گھر پہنچا تو مجھے ان سارے حالات کا علم ہوا اور مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ ہماری کوٹھی بینک میں گروی رکھی ہوئی ہے۔ لاکھوں روپیوں کا قرض ہے اگر ایک مہینے میں قرض ادا نہیں کیا گیا تو بینک والے کوٹھی پر قبضہ کر کے اُسے نیلام کروا دیں گے اور ہمیں خالی ہاتھ گھر سے باہر نکال دیا جائے گا۔ اس بات کا پتہ جب میری والدہ کو لگا تب سے اُن کا رو رو کے برا حال ہے۔''

''اور تمہارے والد؟''

''یہ ساری مصیبتیں میرے والد کی وجہ سے ہی آئی ہیں۔ دادا جی نے یہاں بڑے بازار میں انھیں کپڑوں کی بڑی دکان خرید کر دی تھی۔ لیکن وہ جوئے، شراب اور کرکٹ کی شرطوں میں سب کچھ برباد کر چکے ہیں۔ دکان بھی دوسروں نے خرید لی ہے۔ اب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ہمارے چند مکانات بھی تھے جو کرایہ پر اٹھائے ہوئے تھے۔ والد صاحب نے انھیں بھی اونے پونے داموں میں فروخت کر دیا ہے ایک کوٹھی بچی ہے جس پر لاکھوں روپیوں کا قرض ہے۔ بینک والے کبھی بھی آ کر ہمیں کوٹھی سے بے دخل کر سکتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''وہ سب تو ٹھیک ہے۔ میں اس میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ تم میرا کہا مانو اور اپنے دادا جان کے مسودوں کو غور سے پڑھو۔ ان میں ہی تمہیں ان پریشانیوں سے نکلنے کا راستہ ملے گا۔ اس بات کا مجھے یقین ہے۔''

لڑکے نے کہا: ''انکل میں وہی کرنا چاہتا تھا لیکن جب میں نے اس الماری کو کھولا جس میں وہ مسودے رکھے ہوئے تھے تو میں نے دیکھا کہ وہاں کے سارے مسودے غائب تھے۔''

''ارے، وہ کیسے غائب ہو گئے؟''

لڑکے نے کہا: ''میں نے جب اس تعلق سے اپنی والدہ سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ میرے والد انہیں بھی پرانی کتابوں کے بیوپاری کو فروخت کر چکے ہیں۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا تو انھوں نے اس بیوپاری کا پتہ بتایا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وہ دکان لگا کر بیٹھتے ہیں۔ میں اِن کے پاس گیا۔ ان مسودوں کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ مسودے تمہارے والد میرے پاس لائے ضرور تھے۔ میں نے انہیں اس کی اچھی قیمت دی تھی لیکن ابھی ایک ہفتہ قبل یہاں غالب اکادمی میں ایک سیمینار ہوا تھا۔ وہاں پر پورے ملک سے لوگ آئے تھے۔ میری دکان پر ناگپور سے آئے ہوئے کچھ ادیب آئے انھوں نے ان مسودوں کو دیکھا اور خرید کر لے گئے۔''

میں نے بیوپاری سے ان کے نام اور پتے پوچھے لیکن اسے کچھ معلوم نہ تھا وہ صرف یہی بتا سکے کہ وہ ناگپور سے یہاں سیمینار میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ وہ اُس وقت سنترے کھا رہے تھے تو ان میں سے ایک ادیب نے اُن سے کہا تھا کہ بڑے میاں یہ جو سنترے تم کھا رہے ہو یہ ہمارے شہر سے ہی آئے ہیں!

اُنھوں نے پوچھا: ''کون سا شہر۔''

اس شخص نے کہا: ''ناگپور، ناگپور سے سنترے پوری دنیا میں جاتے ہیں۔''

''اس طرح انھیں یہ بات یاد رہ گئی اور وہ بات اُنھوں نے مجھے بتائی۔ مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر خوشحال زیدی صاحب بھی سیمینار میں گئے ہوں گے۔ انھیں معلوم ہوگا کہ ناگپور سے کون لوگ یہاں آئے تھے۔ میں جا کر ڈاکٹر خوشحال زیدی صاحب سے ملا۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ ان کی طبیعت خراب چل رہی ہے اس لئے وہ سیمینار میں نہیں جا سکے تھے۔ تب انھوں نے مجھے آپ کا نام اور پتہ بتایا اور مجھ سے کہا کہ وہ ناگپور میں تمہاری سارے لوگوں سے ملاقات کروا دیں گے۔ میں نے گھر میں

بتایا اور یہاں ناگپور چلا آیا۔ اب آپ ہی مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔ وقت بہت کم ہے۔"

میں نے لڑکے سے کہا: "فکر مت کرو۔ اگر وہ مسودے یہاں آئے ہیں تو تمہیں مل جائیں گے۔ مجھے معلوم ہے ناگپور سے ڈاکٹر شرف الدین ساحل صاحب یہاں سے سیمینار میں گئے تھے۔ ہماری بات چیت بھی اس سلسلے میں ہوتی رہتی ہے۔ ابھی تم لمبے سفر سے آئے ہو۔ آرام کرو۔ ظہر بعد ہی ان سے ملاقات ہوگی کیونکہ یہ ان کے سونے کا وقت ہے۔"

میں نے اپنے پلنگ پر اُسے لٹا دیا۔ تھوڑی دیر میں ہی لڑکا سو گیا۔ میں نے اپنے سارے کام نمٹا لئے اور اہلیہ کو لڑکے کے تعلق سے ساری باتیں بتا دیں۔ ظہر سے کچھ قبل لڑکا اٹھا۔ غسل کیا اور اہلیہ سے پتہ پوچھ کر مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ ظہر بعد گھر واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ لڑکا دستر خوان پر بیٹھا کھانے میں مصروف تھا۔ میں نے بھی وہیں بیٹھ کر اس کے ساتھ کھانا کھایا اور تھوڑی دیر بعد ہم ڈاکٹر شرف الدین ساحل صاحب کے دولت کدے کی طرف روانہ ہوئے۔

راستے میں لڑکے نے پوچھا: "انکل یہ ڈاکٹر شرف الدین ساحل صاحب کون ہیں؟"

میں نے کہا: "ڈاکٹر شرف الدین ساحل صاحب شہر ناگپور کی بہت بڑی علمی اور ادبی شخصیت ہیں۔ ساحل صاحب نے ناگپور میں اردو زبان کو نئے سرے سے دریافت کیا، اُسے مضبوطی عطا کی۔ اب تک ان کی مختلف موضوعات پر ۳۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان کا خاص موضوع تحقیق ہے۔ ناگپور کے کئی گمنام شعراء کو دریافت کیا اور ان کی غیر مطبوعہ کتابیں شائع کروائیں۔ دیگر علاقوں کے بھی بہت سے شعراء و نثر نگاروں پر موصوف نے تحقیقی کام کیا ہے۔ خاص طور سے بیان میرٹھی اور عادل ناگپوری

ان دو بڑے شاعروں کے کلام کو برباد ہونے سے بچالیا۔ موصوف کا اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اچھا خاصا کام ہے۔ ان ادبی اور علمی کاموں کے علاوہ موصوف بہت اچھے شاعر اور مقرر بھی ہیں۔ کسی بھی موضوع پر مدلل تقریر کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ ساتھ ہی بستی کے لوگوں کے آپسی جھگڑوں اور تنازعات کو سلجھانے میں بھی موصوف پیش پیش رہتے ہیں۔ آئے دن ان اختلافی مسائل کی مجلسوں میں ساحل صاحب منصفی کے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ گفتار کے بھی غازی ہیں۔ بات چیت میں کوئی ان سے آگے نہیں جاسکتا۔ بہت وسیع مطالعہ ہے۔ انھوں نے زندگی کا طویل حصہ مطالعہ میں صرف کردیا۔ میں نے ایک بار اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ساحل صاحب جتنا وقت ادب میں صرف کررہے ہیں اگر اتنا وقت اپنے پارچہ بافی کے کاروبار میں لگاتے تو یہ بھی یہاں کے کسی بڑے سیٹھ سے کم نہیں ہوتے لیکن موصوف کو تو ادب کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ ساری رات جاگ جاگ کر ادب کی زلفیں سنوارتے رہتے ہیں۔"

لڑکے نے کہا: "کیا وہ ہماری مدد کریں گے؟"

"تم مدد کی بات کرتے ہو تمہارا معاملہ ان کے سامنے جائے گا تو مجھے ایک طرف کردیں گے اور خود ہی تمہارے مسئلے کو حل کرنے میں مصروف ہوجائیں گے۔ تم دیکھنا وہ تم سے کیسی محبت سے پیش آتے ہیں۔ شہر ناگپور میں اردو ادب کو، ادیبوں اور شاعروں کو منظر عام پر لانے کا بہت بڑا کام انجام دے چکے ہیں۔ ناگپور کے بہت سے لوگوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دلوا چکے ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔"

اسی دوران ہم ان کے گھر کے قریب پہنچ گئے۔ وہ گھر میں موجود تھے۔ میں نے اپنا نام بتایا اور انھوں نے دروازہ کھول کر ہمیں اندر آنے کو کہا۔ جب ہم اطمینان سے بیٹھ گئے تو میں نے اس لڑکے کا تعارف کرایا اور اُس کی داستان سنادی۔ ساحل صاحب

نے کہا: ''یہ سچ ہے کہ میں نے کچھ پرانی کتابیں اور مخطوطے جامع مسجد کی سیڑھیوں سے خریدے تھے۔ ابھی دکھاتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر وہ اٹھے اور انھوں نے ایک الماری کھول کر چند کتابیں نکالیں اور لاکر ٹی ٹیبل پر رکھ دیں۔ لڑکا انتہائی پُر تجسس نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ایک مسودے کو اٹھالیا اور پُر جوش لہجے میں بولا: ''یہ میرے دادا جان کی کتاب ہے۔'' ویسی ہی دوسری ایک کتاب اور تھی۔ وہ بھی اس نے ٹیبل پر سے اٹھالی۔ اس نے کہا: ''انکل یہ دونوں کتابیں میرے دادا جان کی ہیں اور بھی کچھ کتابیں ہوں گی۔''

ڈاکٹر ساحل صاحب نے کہا: ''دیکھو یہ دو کتابیں تو میں نے خرید لی تھیں جو اس بیوپاری نے مجھے کافی مہنگے داموں میں دی تھیں۔ وہاں اس وقت یحییٰ نشیط، عظیم راہی اور ڈاکٹر الیاس صدیقی بھی میرے ساتھ تھے۔ انھوں نے بھی کچھ مسودے اور کتابیں خریدی تھیں۔ اگر یہ تمہارے دادا جان کی کتابیں ہیں تو لے جاؤ۔ میں نے تو ابھی انہیں کھول کر بھی نہیں دیکھا ہے۔''

لڑکا میری صورت دیکھنے لگا۔ میں نے ساحل صاحب سے کہا: ''آپ ان کی قیمت لے لیں۔'' یہ کہہ کر میں نے جیب سے پرس نکالا تب انھوں نے مجھ سے کہا: ''ارے بھائی نجیب صاحب یہ ظلم مت کرو۔ اگر ان مسودوں سے کچھ اس کی مصیبت کا حل نکلتا ہے تو یہ میرے لئے بھی خوشی کی بات ہوگی۔ آپ انھیں لے جائیں۔ اگر مجھ سے کچھ مدد لینا ہو تو میں بسر وچشم حاضر ہوں۔''

ہم ان کے گھر سے اٹھ کر میرے گھر چلے آئے۔ گھر پہنچتے ہی ایک کتاب تو لڑکے نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور دوسری میں نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور بغور ایک ایک صفحہ دیکھتے رہے۔ ایک گھنٹہ کے بعد لڑکے نے کتاب میز پر رکھ دی اور مجھ

سے کہا: ''انکل مجھے اردو اچھی نہیں آتی۔ مجھے اس میں کچھ نہیں ملا۔ اب آپ ہی تلاش کر سکتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''عجلت مت کرو۔ یہ بہت اطمینان سے اور غور سے دیکھنا ہوگا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ ان کتابوں کا غور سے پڑھوں گا۔''

میں دن بھر اور پھر رات میں بھی ان دونوں مسودوں کو بغور دیکھتا رہا۔ ان میں ایک تو نظموں کا مجموعہ تھا اور دوسری کتاب نثر کی تھی جس میں الگ الگ موقع سے مختلف موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین تھے۔ نظموں کو بغور پڑھا اور نثری مضامین کا بھی مطالعہ کیا۔ رات دیر تک پڑھتا رہا۔ مجھے ایسا کوئی اشارہ ان میں نظر نہیں آیا کہ جس سے کسی دولت کے پوشیدہ ہونے کا پتہ چلتا۔ رات دو بجے جب نیند کا غلبہ بڑھا تو میں سونے کے لئے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ درمیان میں میرے بیٹے نعمل کا کمرہ تھا جہاں فرش پر لڑکے کا بستر لگا ہوا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ لڑکا اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ میں نے باتھ روم کچن وغیرہ میں اسے دیکھا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ میں سیڑھیوں سے چڑھ کر اوپر ٹیریس پر آیا۔ وہاں ذرا آگے ٹاور پر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ سب سے آخری پائری پر مجھے روشنی کا ایک ہالہ سا چمکتا دمکتا نظر آیا۔ ایسا منور کہ میری آنکھوں میں جھماکا سا ہوا۔ ایک لمحے کے لئے میں ڈر گیا۔ اُلٹے پیروں واپس ہی ہونا چاہتا تھا تب میں نے دیکھا کہ ہالے کی روشنی معدوم ہوگئی اور وہاں لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور فوراً مجھ سے کہا: ''ارے انکل آپ یہاں؟''

میں نے کہا: ''اتنی رات کو یہاں اس سناٹے میں تم کیا کر رہے ہو اور وہ روشنی کیسی تھی جو تمہارے گرد ہالہ کیے ہوئے تھی؟''

اس نے جلدی سے کہا: ''نہیں تو، میں اکیلا یہاں بیٹھا تھا رات کو بھیانک

خواب دکھائی دیا، آنکھ کھل گئی اور میں یہاں آ کر بیٹھ گیا۔"

میں نے کہا: "اچھا چلو نیچے چل کر سو جاؤ۔"

وہ میرے ساتھ نیچے آیا اور اپنے بستر پر سو گیا۔ میں بھی اپنے بستر پر دراز ہو گیا لیکن کافی دیر تک مجھے روشنی کا وہ ہالہ پریشان کرتا رہا۔

سویرے اٹھ کر میں نے لڑکے سے کہا: "میں نے دونوں کتابیں بغور پڑھیں مجھے کچھ نہیں ملا۔ انہیں ساحل صاحب کو دے دیتے ہیں۔ شاید انھیں کہیں کچھ مل جائے ان کی نظریں کافی تیز ہیں۔"

ہم نے ساحل صاحب سے ملاقات کی اور دونوں مسودے ان کے سپرد کر دیئے کہ وہ انہیں غور سے پڑھیں اور اگر کچھ ملتا ہو تو ہمیں بتائیں۔ پھر ہم نے ان سے یحیٰ نشیط کا پتہ لیا اور بس کے ذریعہ ان سے ملاقات کرنے کل گاؤں، ایوت محل کے لیے بس اسٹیشن کی سمت روانہ ہو گئے۔

دوپہر میں ہم بس میں سوار ہوئے۔ موسم خوشگوار تھا۔ بس جب شہر کی حد سے نکل گئی تو کھیتوں اور مرغزاروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بس کی کھڑکیوں سے اندر آ رہی تھی جو گرمی کے اثر کو کم کر رہی تھی۔ میں نے راستے میں تفضّل کریم سے کہا: "تم انگریزی میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہو تو تم نے اردو کہاں سیکھی؟"

تفضّل کریم نے کہا: "میرے دادا جی شروع سے ہی مجھے اردو کے حروف اور لفظ بنانا سکھاتے رہتے تھے۔ میری پھوپھی بھی مجھے لے کر عربی بڑھانے بیٹھتی تھیں اور عربی کے ساتھ ساتھ اردو بھی سکھاتی جاتی تھیں۔ اس طرح چند برسوں میں مجھے عربی کے قاعدے اور اردو کی کتابیں پڑھنی آ گئی تھیں۔ ۱۲ سال کی عمر میں میں نے قرآن مجید مکمل کر لیا تھا۔ اسی کے ساتھ اردو کی ابتدائی جماعتوں کی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ دادا جان مجھے شعر و شاعری کی باتیں اور قدیم زمانے کے قصے بھی سناتے تھے۔ اس طرح

اردو زبان میں مجھے لکھنا پڑھنا آ گیا۔"

میں نے کہا: "ہاں جن گھروں میں اردو زبان میں بات چیت ہوتی ہے اور جہاں کے بچے عربی بھی سیکھتے ہیں، جو ہمارے لئے بہت ضروری ہے، تو ان گھروں کے بچے آسانی سے اردو زبان سیکھ جاتے ہیں، چاہے وہ کسی بھی میڈیم میں تعلیم حاصل کیوں نہ کر رہے ہوں۔"

تفضّل کریم نے کہا: "انکل ابھی ہم جن صاحب سے ملنے جا رہے ہیں یہ اردو زبان کی کس صنف میں ماہر ہیں؟"

میں نے کہا: "بیٹا یہ حضرت سید یحییٰ نشیط صاحب ایک ٹیچر ہیں۔ اردو ذریعۂ تعلیم سے بچوں کو تعلیم دیتے ہیں لیکن اردو زبان کی تاریخ، زبان دانی اور تنقید و تحقیق میں بہت کام کر رہے ہیں۔ خاص طور سے اردو زبان میں جو حمد اور مناجات لکھی گئی ہیں اس پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر نشیط صاحب کا ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ کل گاؤں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور وہاں کی عام زبان مراٹھی ہے۔ موصوف کو بھی مراٹھی زبان پر اچھی دسترس ہے۔ اس زبان کا انھوں نے تفصیلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس لئے اردو اور مراٹھی زبان کا آپس میں کیا رشتہ بنتا ہے۔ اس بارے میں بھی تحقیق کر رہے ہیں کیونکہ اردو زبان میں فارسی کے ہزاروں الفاظ ہیں۔ اسی طرح مراٹھی میں بھی فارسی زبان کے سینکڑوں الفاظ موجود ہیں۔ اسی بنیاد پر ان کی تحقیق جاری ہے۔ اردو زبان کی جو معیاری شاعری ہے اس پر بھی موصوف کے مضامین اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں مضامین کی وجہ سے پورے ملک میں ان کی شہرت ہے۔ اس لئے ایسے موضوعات پر جہاں کہیں بھی سیمینار ہوتے ہیں یحییٰ نشیط صاحب کو مقالہ پڑھنے کے لیے بلوایا جاتا ہے۔ غالب کے سیمینار میں شرکت کے لیے دہلی گئے تھے اور تمہارے دادا جی کی کتاب خرید کر لے آئے، ان کا مطالعہ بہت وسیع

ہے اور مطالعہ کی وسعت ہی کسی پڑھے لکھے آدمی کی قابلیت میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔"

تفضّل کریم نے کہا: "ویسے یہ یحییٰ نشیط صاحب آدمی کیسے ہیں۔ ہماری مدد کریں گے؟"

میں نے کہا: "یحییٰ نشیط صاحب کے بارے میں کیا تم کسی سے بھی پوچھو گے تو وہ صرف ان کے لیے ایک ہی لفظ کہے گا "شریف النفس"۔ اخلاق، اخلاص اور مروت والے آدمی ہیں۔ کسی کی دل آزاری ان کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے۔ بہت کم بولتے ہیں لیکن جو بولتے ہیں وہ بامقصد بولتے ہیں۔ نمود و نمائش سے دور، بہت ہی سادگی پسند آدمی ہیں۔ سفید کرتا، پائجامہ، رومال اور کالے رنگ کی ٹوپی یہ ان کا سدا کا لباس ہے۔ دوران گفتگو تبسم ان کے چہرے پر رقص کرتا رہتا ہے۔ آہستہ لہجے میں اور مدھم آواز میں بات کرتے ہیں۔ بڑے باکمال آدمی ہیں۔"

اسی طرح بات چیت کرتے ہم کل گاؤں پہنچ گئے۔ شام کے سات بجے ہم ان کے گھر پہنچے۔ میں نے تفضّل کریم کا ان سے تعارف کرایا اور اس کی پوری داستان انہیں سنادی۔ ساحل صاحب سے ملاقات کا حال بھی ان سے بیان کر دیا۔ انھوں نے کہا: "ہاں میں نے دو مخطوطے دلّی سے خریدے تھے۔ وہ تو بہت بڑی ادبی شخصیت تھے۔ یہ اگر زیور طباعت سے آراستہ ہو جاتے تو ساری اُردو دنیا میں ان کا نام ہوتا۔" پھر وہ اندر گئے اور دلّی سے خریدی ہوئی کتابیں لاکر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ لڑکے نے فوراً اپنے دادا جان کی دونوں کتابوں کو اٹھا لیا۔ یحییٰ نشیط صاحب نے کہا: "ہاں یہی وہ کتابیں ہیں جو حضرت کی لکھی ہوئی ہیں۔ اگر ان کتابوں سے آپ کی مصیبت دور ہو سکتی ہے تو آپ انھیں لے جائیں، میں انھیں بخوشی دینے کے لئے تیار ہوں۔"

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور رات کی بس سے واپس ناگپور آ گئے۔ ظہر بعد ہم

نے پھر سے ساحل صاحب سے ملاقات کی اور ان دو مخطوطوں کے ملنے کی انہیں اطلاع دی۔ انھوں نے کہا: ''کل رات بھر دونوں مسودوں کو دیکھتا رہا۔ مجھے کچھ ٹھوس بات تو نہیں ملی ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ملے گا ضرور۔''

یحیٰ نشیط صاحب سے لائی ہوئی دونوں کتابیں بھی ہم نے ان کے حوالے کر دیں اور عظیم راہی صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے اورنگ آباد نکل پڑے۔ جب ہم بس میں بیٹھے اورنگ آباد کی طرف جا رہے تھے تب لڑکے نے مجھ سے پوچھا: ''انکل یہ عظیم راہی کون صاحب ہیں؟''

''بیٹا یہ عظیم راہی صاحب میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ اورنگ آباد میں رہتے ہیں۔ ویسے تو وہ ٹیکنیکل آدمی ہیں، ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے ہیں لیکن اصل کام تو وہ اردو ادب کا کر رہے ہیں۔ بہترین ناظم جلسہ و مشاعرہ ہیں لیکن ان کا خاص میدان ''افسانچہ'' کا ہے۔ ہندوستان میں انھوں نے افسانچہ کو نہ صرف پہچان دلائی بلکہ دوسرے لوگوں کو افسانچہ نگاری کی طرف راغب بھی کیا۔ آج عظیم راہی کی کوششوں سے افسانچہ نے مضبوطی حاصل کر لی ہے۔ بہت سے لوگ ان کے افسانچوں کو پڑھ پڑھ کر افسانچہ نگار بن گئے ہیں۔ عظیم راہی صاحب اس فن پر ڈاکٹر آف فلاسفی کے لیے بڑا مضمون لکھ رہے ہیں۔ وہ اردو کے بڑے افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اردو زبان کے بڑے رسائل میں عظیم راہی صاحب کی تخلیقات نمایاں طریقے سے شائع ہوتی ہیں۔ افسانچہ اور افسانوں کی محفلوں میں دور دراز مقامات سے انھیں شرکت کے لیے بلوایا جاتا ہے۔ وہ صرف نام کے ہی عظیم نہیں ہیں بلکہ واقعی عظیم آدمی ہیں۔ میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دوست نواز ہیں، ادب نواز ہیں، ادیب نواز ہیں۔ تم دیکھنا وہ مجھے دیکھ کر یوں خوش ہو جائیں گے گویا ان کا کوئی بچھڑا ہوا عزیز برسوں بعد ان سے مل رہا ہو۔''

اسی طرح بات چیت کرتے ہوئے ہم اورنگ آباد پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے عظیم راہی صاحب سے ملاقات کی۔ میں نے اپنی آمد کی اطلاع انہیں فون پر دے دی تھی۔ انھوں نے کھانے پینے اور نشست کا اچھا انتظام کرلیا تھا۔ میں نے اپنی آمد کا مقصد انہیں بتایا اور انھوں نے دلّی سے خریدی ہوئی کتابیں ہمیں دکھائیں۔ ایک مسودے کو لڑکے نے فوراً پہچان لیا۔ وہ کتاب بھی عظیم راہی صاحب نے بخوشی ہمیں عنایت کردی۔ رات کی بس سے ہم واپس ناگپور آگئے۔ دوسرے دن پھر سے ساحل صاحب سے ملاقات کی اور اس پانچویں کتاب کے حصول کا احوال انہیں سنایا۔ انھوں نے بتایا کہ چاروں کتابیں میرے مطالعے میں ہیں۔ ابھی کچھ سراغ نہیں ملا ہے۔ شاید اس مسودے سے کچھ معلوم ہو سکے۔ ہم نے وہ مسودہ بھی ان کے سپرد کردیا۔ میں نے لڑکے سے کہا: ”رات کی ٹرین سے مالیگاؤں چلتے ہیں۔ الیاس صدیقی صاحب سے مل کر ان کے پاس کی کتابیں بھی لے آتے ہیں۔“

پھر تھوڑی دیر بعد میں نے کہا: ”ساری کتابیں مل چکی ہیں۔ صرف دو کتابیں رہ گئی ہیں۔ وہ اگر ان کے پاس مل گئیں تو ان کتابوں میں سے ہی کسی کتاب میں تمہاری مصیبتوں کا حل مل جائے گا۔“

لڑکے نے کہا: ”جی چچا جان مجھے لگتا ہے اب مجھے پتہ چل جائے گا کہ دادا جان نے میرے لئے ان کتابوں میں کیا اشارہ دیا ہے۔ گھر میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہمارے خاندانی زیورات دادی نے انہیں دیئے تھے۔ وہ زیورات میرے ابو نے بہت تلاش کئے مگر انہیں کہیں ملے نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ دادا جی نے انہیں کہیں چھپا دیا ہے اور اس کا کچھ اشارہ ان کتابوں میں محفوظ کردیا ہے۔ چچا جان آپ نے میرے لئے کافی محنت کی پیسے بھی خرچ کررہے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے اچھی خاصی دولت ملی تو اس میں سے دس فیصد حصہ آپ کو دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

میں نے لڑکے سے کہا: ''مجھے پیسوں کی لالچ نہیں ہے۔ تمہاری دولت تمہیں مل جائے، کوٹھی کی رقم بینک والوں کو ادا کر دی جائے اور تمہاری مصیبتیں ختم ہو جائیں، بس یہ کام ہو جائے تو مجھے اطمینان ہو جائے گا۔''

لڑکے نے کہا: ''پھر بھی میں دس فیصد حصہ اس میں سے آپ کو ضرور دوں گا۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ بات آپ سے کہتا ہوں۔''

میں نے کہا: ''چلو ٹھیک ہے پہلے خزانہ تو ملے۔'' اتنا کہہ کر میں ہنس پڑا۔

رات کی ٹرین سے ہم مالیگاؤں کے لئے روانہ ہوئے۔ سفر کے دوران میں نے اسے بتایا کہ الیاس صدیقی شہر مالیگاؤں کی مشہور و معروف ادبی اور سماجی شخصیت ہیں۔ ۳۰ سال سے پیشۂ درس و تدریس میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ادب کی مختلف اصناف میں سکۂ رائج الوقت کی طرح چلتے ہیں۔ کیا شاعری، کیا نثر نگاری اور کیا صحافت سب جگہ چھائے رہتے ہیں۔ موصوف ایک بہت اچھے ناظم جلسہ بھی ہیں۔ مشاعروں کی نظامت میں بھی مہارت حاصل ہے۔ ماہر لسانیات ہیں، اسی لئے درسی کتابوں کی ترتیب کے کاموں میں ایک عرصۂ دراز سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ شاعری میں ''وسیم'' تخلص استعمال کرتے ہیں۔ موصوف کا بڑا کام ہے۔ مالیگاؤں میں نثر نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھنا اور اسی مقالے پر موصوف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی ہے۔ مالیگاؤں کی نثر نگاری میں وہ ایک مستند کتاب ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مالیگاؤں کے قلعے کے تعلق سے بھی تحقیقی کتاب لکھی ہے جس کو مراٹھی زبان میں بھی لکھ کر شائع کروایا ہے۔ شاعری کی مختلف اصناف پر انھیں عبور حاصل ہے۔''

منماڑ ریلوے اسٹیشن سے ہم صبح سویرے بس سے مالیگاؤں کے لئے روانہ ہوئے۔ صبح آٹھ بجے ہم الیاس صدیقی صاحب کے دولت کدے پر تھے۔ ٹھکانہ مجھے معلوم تھا۔ پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ الیاس صدیقی صاحب نے میرا نام سنا تو

بیدار ہو گئے۔ اچانک آمد پر حیرت کا اظہار کرنے لگے۔ انھوں نے منھ ہاتھ دھویا اور ہم لوگوں نے بھی اپنے آپ کو فریش کر لیا۔ تب الیاس صدیقی صاحب نے کہا: ”اور بتاؤ یار یہ اچانک صبح سویرے میرے غریب خانے پر آمد؟ کیا معاملہ ہے؟ یہ بچہ کون ہے؟“

میں نے تفضّل کریم کی پوری داستان انہیں سنادی۔ تب انھوں نے کہا: ”ٹھیک ہے۔ میں دہلی گیا تھا۔ دو مسودے میں نے وہاں سے خریدے تھے لیکن وہاں میری لائبریری میں رکھے ہوئے ہیں۔ چلو ناشتہ کر لیں تو لائبریری چلتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہم نے ناشتہ کیا اور ہم تینوں آٹو رکشہ سے ان کی لائبریری میں پہنچ گئے۔ ان کی لائبریری میں کتابیں سب ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ فوراً ہی انھوں نے وہ کتابیں اور مسودے جو وہ دہلی سے خرید کر لائے تھے ٹیبل پر لا کر رکھ دیئے۔ لڑکے نے فوراً ایک مسودہ کو پہچان لیا۔ فوراً اسے اٹھالیا اور کہا: ”ایک کتاب اور ہوگی۔“

تب ڈاکٹر الیاس صدیقی صاحب نے کہا: ”ہاں ایک اور مسودہ تھا۔ ہوا یہ کہ گذشتہ دنوں ممبئی سے فاروق سید یہاں ایک پروگرام میں آئے تھے۔ وہ میرے ساتھ میری لائبریری بھی دیکھنے آئے تھے۔ میں نے دہلی سے خریدے ہوئے ان مسودوں کے متعلق انھیں بتایا۔ جب انھوں نے مثنوی کا مسودہ دیکھا تو اسی وقت چند مثنویوں کے بہت سے اشعار پڑھ لئے۔ پھر مجھ سے درخواست کی کہ میں وہ مسودہ انھیں دے دوں تاکہ وہ ان نظموں کو اپنے رسالے گل بوٹے میں قسط وار شائع کر سکیں۔ میں نے وہ کتاب انھیں دے دی تاکہ وہ ان مثنویوں کو اپنے رسالے میں قسط وار شائع کرتے رہیں۔ ساتھ ہی ہر مہینے میرا حوالہ بھی دیں کہ یہ نظمیں ڈاکٹر الیاس صدیقی صاحب سے حاصل ہوئی ہیں تو وہ مسودہ وہ لے کر چلے گئے ہیں۔ وہ انھیں کے پاس ملے گا۔“

ڈاکٹر الیاس صدیقی صاحب سے ہم نے ایک مسودہ لے لیا اور اسی وقت ہم مالیگاؤں سے نکل کر منماڑ ریلوے اسٹیشن پر آگئے۔ دو گھنٹے میں وہاں سے ممبئی جانے

والی ٹرین ہمیں مل گئی اور اس ٹرین سے ہم ممبئی پہنچ گئے۔ وی ٹی ریلوے اسٹیشن پر اترے۔ باہر نکل کر آئے۔ ہم نے ناگپاڑہ جنکشن کے لیے ٹیکسی لی اور ہم فاروق سید سے ملنے کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں تفضّل کریم نے مجھ پوچھا کہ فاروق سید صاحب کیسے آدمی ہیں؟

میں نے کہا: ”فاروق سید صاحب ممبئی میں اردو ادبِ اطفال کے مشعل بردار ہیں۔ ان کی وجہ سے بچوں کے ادب کی روشنی پورے ملک میں پھیل رہی ہے۔ موصوف ایک ماہوار رسالہ ”گل بوٹے“ کے نام سے جاری کئے ہوئے ہیں۔ یہ رسالہ ممبئی کی تمام اسکولوں میں پہنچتا ہے۔ بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ گل بوٹے کی اشاعت ۱۵ر سے ۱۸ر ہزار کے قریب ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ رسالہ ماہنامہ کھلونا سے بھی آگے نکل گیا ہے۔“

اسی طرح بات کرتے ہوئے ہم ناگپاڑہ جنکشن پہنچ گئے۔ ہم ٹیکسی سے اتر گئے اور پٹیل آرکیڈ کے کیڈی شاپنگ سینٹر کی جانب بڑھے۔ فاروق سید کا دفتر اسی بلڈنگ کے روم نمبر ۲۸ میں تھا۔ یہ کمرہ گراؤنڈ فلور کے بالکل آخری کونے میں واقع ہے۔ میں ان کے دفتر میں کئی بار حاضری دے چکا تھا لہٰذا مجھے وہاں پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ فاروق سید صاحب اپنے دفتر میں اپنی کرسی پر موجود تھے۔ میں نے انھیں سلام کیا اور ان کے دفتر میں داخل ہوا۔ انھوں نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا۔ اپنے بھتیجے کو چائے لانے کے لئے کہا۔ میں نے تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد تفضّل کریم کا تعارف ان سے کرایا اور اس کی داستان انھیں سنادی۔

فاروق سید صاحب نے کہا: ”ابھی دو روز پہلے ہی میں مالیگاؤں سے جناب الیاس صدیقی صاحب سے وہ مسودہ لے کر آیا ہوں۔ دیکھو وہ حافظ صاحب اسی مثنوی کی کمپوزنگ کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا کہ مہربانی کر کے وہ کام رکوا دیں اور وہ مسودہ ہمیں عنایت کر دیں۔
فاروق سید صاحب نے اسی وقت حافظ صاحب سے وہ کتاب اپنے پاس منگوا لی۔ تفضل کریم نے اس مسودہ کو دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔
فاروق سید صاحب نے کہا کہ اگر اس مسودہ سے اس بچے کی پریشانی دور ہو سکتی ہے تو اسے شوق سے لے جائیں مگر الیاس صدیقی صاحب کو بھی اس بات سے آگاہ کر دیں۔
میں نے کہا کہ میں ان سے اجازت لے کر ہی یہاں آیا ہوں۔ میں انھیں آگاہ کر دوں گا کہ مثنوی کا مسودہ مجھے مل چکا ہے۔
ہم تھوڑی دیر گل بوٹے کے دفتر میں بیٹھے رہے۔ ادبِ اطفال پر گفتگو کرتے رہے۔ پھر ان سے اجازت لے کر ہم وہاں سے نکل کر باہر آ گئے۔ ہماری واپسی کے لیے رات کی ٹرین تھی۔ اس لیے میں نے ممبئی کے کچھ مشہور مقامات تفضل کریم کو دکھلا دیئے۔ رات کی ٹرین سے ہم ناگپور واپس آ گئے۔ وہ مسودے جو الیاس صدیقی صاحب سے اور فاروق سید صاحب سے ملے تھے صبح ان کو دیکھنے کے لیے بیٹھ گئے۔ تب لڑکے نے مجھ سے کہا: ''انکل اب مجھے لگتا ہے کہ ان کتابوں میں مجھے میری پریشانیوں کا حل مل جائے گا۔''
میں نے کہا: ''ہاں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔''
میں نے ان کتابوں کو غور سے دیکھا۔ ایک غزلیات کا مجموعہ تھا۔ دوسرے میں 12 مثنویاں تھیں اور ہر مثنوی میں ساٹھ سے زیادہ اشعار تھے۔ غزلوں کو بھی میں نے بغور دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ لڑکے کے دادا کو زبان و بیان پر اچھی قدرت حاصل تھی۔ ایسی رواں دواں زبان، لفظوں اور محاوروں کا برجستہ استعمال اور خیال آفرینی کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ انھیں پڑھنا شروع کرو تو ان میں ہی گم ہو جاؤ۔ پوشیدہ دولت

کے متعلق کیا اشارہ ہے بھول جاؤ۔ ظہر کے وقت تک ہم دونوں، دونوں مسودوں کو دیکھتے رہے لیکن کوئی نشان ہاتھ نہیں لگا۔

مثنوی میں پرانے قصے کہانیوں کو نظم کیا گیا تھا۔ بادشاہ، شہزادے، ملکائیں، پری، جانور، درندے، پرندے وغیرہ وغیرہ کا بیان تھا۔ ہر مثنوی کے الگ الگ عنوانات دیئے گئے تھے۔ انہیں پڑھنا وقت طلب کام تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد ہم پھر سے ساحل صاحب سے ملنے ان کے گھر پہنچ گئے۔ وہ گھر پر ہی مل گئے۔ الیاس صدیقی صاحب اور فاروق سید صاحب سے حاصل شدہ دونوں مسودے ہم نے انھیں دے دیئے۔ انہوں نے کہا: ''نجیب صاحب، کافی محنت کرنی پڑے گی۔ تین دن سے میں انھیں کے مطالعہ میں مصروف ہوں۔ اب یہ دونوں مسودے بھی آج رات میں دیکھ لیتا ہوں۔ عشاء بعد آپ آیئے غور کریں گے۔'' پھر وہ تفضل کریم کی طرف مڑے اور کہا: ''بیٹا گھبرانا نہیں تیری مصیبتوں کا حل انہیں مسودوں میں ملے گا۔ میں تجھے نکال کر دوں گا۔ تو گھبرا مت، بس دو دن میں ان کتابوں کو دیکھ کر میں تجھے بالکل پکا پتہ بتا دیتا ہوں، بے فکر ہو کر جا۔ یہ نجیب صاحب بھی آخر تک تیری مدد کریں گے۔ یہ سمجھ لے کہ تو بالکل صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔''

لڑکا حیرت سے اور افسردگی کے عالم میں ان کی صورت ہی تکتا رہا۔ اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔

عشاء بعد میں ساحل صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ ہم نے سارے مسودوں کو ایک ایک کر کے بغور دیکھا۔ ایک ایک صفحہ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ حاشیہ میں لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھا۔ جہاں کاٹ چھانٹ ہوئی تھی انہیں بغور دیکھا لیکن کچھ ٹھوس ثبوت ہاتھ نہیں لگا، رات کے ایک بجے میں تو اٹھ کر چلا آیا۔ ساحل صاحب رات بھر خزانہ تلاش کرتے رہے۔

دوسرے دن دوپہر میں ہم نے پھر سے ان سے ملاقات کی۔ آج وہ بہت پر اعتماد نظر آرہے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو کہا: ''نجیب صاحب یہ جو مثنویوں کا مسودہ فاروق سید صاحب کے پاس سے ملا ہے خزانہ اسی میں پوشیدہ ہے۔ میں سمجھ گیا۔'' پھر تفضل کریم کو مخاطب کر کے بولے: ''ابے تیرے دادا واقعی بہت پہنچی ہوئی چیز تھے۔ حضرت نے اتنا ادبی وعلمی سرمایہ شائع کروایا ہوتا تو آج پوری دنیا میں ان کا نام ہوتا۔ بڑھوؤ واقعی بہت پہنچی ہوئی ہستی تھے۔ تو گھبرا مت میں تجھے ان کی پوشیدہ دولت کا پتہ بتاؤں گا۔''

لڑکے نے کہا: ''جی انکل مجھے لگتا ہے کہ مجھے یہاں کچھ نہ کچھ سراغ ضرور ملے گا۔''

ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔ لڑکا دن کے وقت گھر کے نیچے میری سائیکل کی دکان میں آکر بیٹھ جاتا تھا۔ کچھ کام کرتا رہتا تھا۔ میرا بھتیجہ جاوید شام کو اسے اپنی ہونڈا گاڑی پر بٹھا کر شہر گھمانے پھرانے لے جاتا تھا۔ لیکن افسردگی جو اس کے چہرے کا لازمی جز بن گئی تھی کسی طرح ختم نہ ہونے پاتی تھی۔ اس دن میں رات کو ساحل صاحب کے گھر گیا تو انھوں نے ایک مثنوی کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''نجیب صاحب یہ جو مثنوی ہے اس کا عنوان ہے ''شہزادہ اور گمشدہ خزانہ'' مجھے لگتا ہے کہ اسی میں لڑکے کے دادا نے کوئی چیز بیان کی ہے جس سے ان کی پوشیدہ دولت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ یہ لڑکا شہزادہ ہے اور گمشدہ خزانہ یعنی انھوں نے جو دولت چھپائی ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ اشارہ اسی میں ملے گا۔ میں اس حصے کو دس بار پڑھ چکا ہوں۔ توشیحی نظموں کی طرح تمام حروف کو بھی جمع کر کے دیکھ چکا ہوں لیکن کوئی صاف تحریر نہیں بن رہی ہے۔ لو تم بھی دیکھ لو۔''

میں نے طویل مثنوی کے اس حصے کو پڑھنا شروع کیا۔ اس میں یہ واقعہ نظم کیا گیا

تھا کہ جب غدّار وزیر نے دھوکے سے بادشاہ کو قید میں ڈال دیا تو شہزادہ اپنی جان بچانے کے لئے چند مصاحبوں کے ساتھ فرار ہو گیا اور جنگل میں پہنچ گیا۔ وہاں اسے ایک شہزادی ملی جو کسی جادوگر کے خوف سے اس جنگل میں آ گئی تھی۔ شہزادی اور مصاحبوں کے ساتھ شہزادہ جنگل میں دن کاٹ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک نقشہ تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ محل کے کسی حصے میں بادشاہ نے خزانہ چھپا رکھا ہے اس خزانہ کی دولت سے شہزادہ دوبارہ اقتدار حاصل کر سکتا تھا لیکن محل میں جانا وہاں جا کر خزانہ کو تلاش کرنا اور اسے محل سے باہر نکالنا بہت ہی خطرناک کام تھا۔ اس کام میں ایک پری اس کی مدد کرتی ہے اور شہزادے کو اس مصیبت سے چھٹکارہ دلاتی ہے۔"

یہ سیدھی سادی سی ایک کہانی تھی۔ اس میں اس لڑکے تفضّل کریم کے لئے کیا اشارہ دیا گیا ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں نے بھی اس حصے کو بار بار پڑھا اور اس میں کچھ اشارہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

اس وقت لڑکا وہاں موجود تھا۔ میں نے اس سے کہا: "تمہاری کوٹھی کی بناوٹ بتاؤ۔"

اس نے کہا: "ہماری یہ کوٹھی 20 ہزار اسکوائر فٹ کے پلاٹ پر بنی ہوئی ہے۔ اس میں تین ہزار اسکوائر فٹ پر تعمیری کام ہوا ہے۔ باقی حصہ خالی پڑا ہوا ہے۔ کوٹھی کے پچھلے حصے میں پانچ ہزار اسکوائر فٹ پر گارڈن بنا ہوا ہے جو اب اجاڑ ہو چکا ہے۔ داہنی اور بائیں جانب نوکروں اور مہمانوں کے لئے کوارٹرس بنے ہوئے ہیں۔ وہ بھی برباد شدہ حالت میں ہیں۔ کوٹھی دو منزلہ ہے۔ اس میں ہم اور ہمارے کچھ رشتے دار آباد ہیں۔"

ساحل صاحب نے کہا: "مجھے لگتا ہے کہ اس مثنوی میں جس محل کا ذکر ہوا ہے دراصل وہی ان کی کوٹھی ہے اور کوٹھی کے کسی نہ کسی حصے میں خزانہ یعنی ان کے پرکھوں کی

دولت چھپا کر رکھی گئی ہے۔"

میں نے اس نظم کو زیراکس کروالیا اور ساحل صاحب سے کہا کہ وہ اصل کاپی دیکھیں میں زیراکس میں دیکھتا ہوں۔" میں وہ زیراکس کاپی اپنے ساتھ گھر لے کر آ گیا۔ رات کے وقت اس نظم کا زیراکس کاغذ لے کر بیٹھ گیا اور مختلف زاویوں سے اُس نظم کو دیکھنے لگا۔ وہ 65 اشعار پر مشتمل نظم تھی۔ اس نظم کو لکھنے میں اس بات کی احتیاط کی گئی تھی کہ ہر لفظ کے بعد تھوڑی سی جگہ چھوڑی گئی تھی اس طرح لفظ ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں تھے۔ ہر لفظ الگ الگ نظر آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہو نہ ہو انہیں شعروں کے لفظوں سے کوئی عبارت بنتی ہوگی جو پوشیدہ دولت کا پتہ بتائے گی۔ میں نے شعر کے آغاز کے حرفوں، اختتام کے حرفوں کو ملا کر دیکھا لیکن کچھ معنی خیز عبارت نہیں بن پائی۔ اسی طرح میں دیکھ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ پہلے شعر کے پہلے لفظ کا پہلا حرف، دوسرے شعر کے دوسرے لفظ کا پہلا حرف، تیسرے شعر کے تیسرے لفظ کا پہلا حرف اور چوتھے شعر کے چوتھے لفظ کا پہلا حرف۔ اسی ترتیب سے حروف کو ترتیب سے رکھا تو ایک جملہ بن گیا۔ جہاں یہ جملہ ختم ہوا تھا وہیں سے آخری شعر کا آخری حرف اور اس سے نیچے کے شعر کا دوسرا حرف اور اسی ترتیب سے حروف کو جمایا تو ایک عبارت بن گئی جو اس طرح تھی۔ "پشت کے باغ کے مشرقی گوشے میں پیپل کے درخت کے پاس زمین کھودو تمہیں زیورات ملیں گے۔" ان حروف کو ایک سے زائد بار میں نے ترتیب سے دیکھا اور وہی عبارت بنی۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے اور گاڑی اٹھا کر سیدھے ڈاکٹر شرف الدین ساحل صاحب کی کمپیوزنگ شاپ پر آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ رات بھر جاگتے رہتے ہیں اور ان کا بیٹا محمد رفیع الدین رات بھر کمپوزنگ کرتا رہتا ہے۔ میں ان کی دکان پر پہنچا تو وہ اکیلے بیٹھے ہوئے تھے اور مثنوی کی کتاب کو بغور دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو خوش ہو گئے۔ میں

اپنی گاڑی کھڑی کرر ہا تھا تبھی انھوں نے کہا: ”آیئے نجیب صاحب، میں ابھی آپ کو فون کروانے ہی والا تھا۔“

میں نے کہا: ”کیا ہوا؟ حل مل گیا کیا؟“

”ارے پورا کا پورا حل مل گیا ہے۔ ہم مثنوی ”شہزادے اور خزانے“ میں خزانہ تلاش کرر ہے تھے۔ اس میں کچھ نہیں ہے۔ یہ دیکھو صفحہ 62 پر ایک مثنوی ہے ”پلنگ کی کرامت“ اس مثنوی کو پڑھو اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ مہمان خانے میں جو پلنگ ہے وہ عجیب طرح سے بنایا گیا ہے۔ سرہانے کی سمت نیچے اگر بے چینی کے عالم میں جھانک کر دیکھیں تو عجیب سی روشنی پھوٹتی نظر آتی ہے اور تھوڑی دیر میں بے چینی ختم ہو جاتی ہے۔ دل و دماغ پر اطمینان بلکہ مسرت کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ مجھ پر جب بہت زیادہ پریشانی ہوتی ہے تو میں مہمان خانے کا دروازہ اندر سے بند کر لیتا ہوں اور فرش پر بیٹھ کر پلنگ کے سرہانے کو کچھ دیر تک غور سے دیکھتا رہتا ہوں۔ قلب مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر میں میری ساری پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ پلنگ اپنے اندر کراماتی اثر رکھتا ہے۔ یہ پلنگ میرے دادا جی نے خاص طور سے اپنے لئے بنوایا تھا۔ پرانا ہو جانے کے بعد اسے مہمان خانے میں رکھوا دیا گیا ہے یہ بہت بھاری پلنگ ہے اسے اپنی جگہ سے ہلانے کے لئے بھی آٹھ آدمی درکار ہوتے ہیں۔ مجھے اس کا تجربہ ہے واقعی یہ کراماتی پلنگ ہے۔ یہ بات صرف میں جانتا ہوں۔“

میں نے کہا: ”اس مثنوی سے کیا مطلب نکل رہا ہے؟“

انھوں نے کہا: ”وہ جو مہمان خانے کا پلنگ ہے اس کے سرہانے نچلی جانب کوئی خانہ بنا ہوا ہے جس میں میرے خیال سے ہیرے یا اشرفیاں پوشیدہ ہیں۔ حضرت کو جب پریشانی ہوتی تھی وہ اندر سے دروازہ بند کر کے کچھ ہیرے یا اشرفیاں نکال لیتے تھے اور ان سے ان کی پریشانیاں دور ہو جاتی تھیں۔“

میں نے کہا: ”ہاں نظم سے تو یہی مطلب نکل رہا ہے۔“

انھوں نے اپنی بات پر زور دے کر کہا: ”میری بات مانو۔ اصل معاملہ یہی ہے۔ اصل دولت وہیں چھپی ہوئی ہے اور اسی سے ان لوگوں کی پریشانی دور ہو سکتی ہے۔“

میں نے ان کی پُر اعتماد باتیں سنیں تو جو کچھ میں نے دریافت کیا تھا وہ میں نے انھیں نہیں بتایا اور یہی کہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا: ”جایئے لڑکے کو بتا دیجئے اور اُسے لے کر دتی چلے جایئے اور نہایت احتیاط سے اس دولت کو باہر نکالئے اگر اس کے والد کو پتہ چل گیا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔“

میں نے کہا: ”جی بہتر ہے۔“

ان سے اجازت لے کر گھر آیا۔ نعمل کے کمرے میں فرش پر تفضل کا بستر لگا ہوا تھا میں نے دیکھا اس کا بستر خالی پڑا ہوا تھا۔ میں بہت حیران ہوا۔ باتھ روم میں دیکھا، اپنے بیڈ روم میں دیکھا، کچن اور ڈرائنگ روم میں دیکھا، ٹیرلیس پر دیکھا وہاں دروازے پر تالا لگا ہوا تھا لیکن وہ گھر میں کہیں موجود نہیں تھا۔ میں نے اہلیہ کو جگایا اور پوچھا: ”لڑکا کہاں ہے؟“

انھوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے اپنے مکان کا کونہ کونہ چھان مارا، وہ کہیں نہیں ملا۔ نیچے اتر کر سڑک پر آیا۔ سامنے کے میدان میں لال اسکول کے اطراف میں دیکھا لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں نے گاڑی اٹھائی اور ڈاکٹر شرف الدین ساحل صاحب کے کمپوزنگ سینٹر پر آیا۔ انھیں بتایا کہ لڑکا غائب ہو گیا ہے، اِدھر تو نہیں آیا۔ انھوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں از حد پریشان تھا۔ ساحل صاحب نے کہا کہ وہ روزانہ فجر کی نماز پڑھنے جاتا ہے۔ دیکھو شاید مسجد میں تو نہیں ہے۔ میں نے گاڑی آگے بڑھائی مسجد بکر قصاب میں جھانک کر دیکھا گرل (grill) کے دروازے میں قفل لگا ہوا تھا۔ اندر سناٹا تھا۔ اندر ایک ٹیوب لائٹ جل رہا تھا۔ مسجد

کا بیرونی ہال صاف نظر آ رہا تھا لیکن وہاں تفضّل کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں الگ الگ زاویوں سے مسجد کے ہر کونے میں دیکھتا رہا۔ گرل گیٹ کے سامنے اندھیرا تھا تبھی کسی نے زوردار آواز لگائی ''ارے کون ہے وہاں مسجد کے دروازے پر؟'' اس آواز کو سن کر میں پیچھے مڑا میں نے آواز لگانے والے شخص کو دیکھا اور پہچان لیا۔ وہ نیاز لیڈر تھے۔ جو صدیق استاد لائبریری کے پچھلے دروازے کی سیڑھی پر بیٹھے ہوئے تھے اور تمباکو کے منجن سے دانت مانجھ رہے تھے کیوں کہ ایسا کئے بغیر انہیں نیند نہیں آتی وہ بستی کے بہت ہی مشہور سماجی خدمت گار ہیں میں نے کہا: ''لیڈر صاحب میں ہوں وکیل نجیب۔''

میرا نام سن کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور میرے قریب آ گئے تعجب سے مجھ سے سوال کیا: ''ماسٹر صاحب آپ اتنی رات کو مسجد میں کیا تلاش کر رہے ہیں؟''

میں نے کہا: ''ہمارے گھر دہلی سے ایک لڑکا آیا ہوا ہے ابھی رات کو میں نے اٹھ کر دیکھا تو وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔ اُسے ہی تلاش کر رہا ہوں۔ وہ نماز پڑھنے اسی مسجد میں آتا ہے۔''

نیاز لیڈر صاحب نے کہا: ''ہاں ایک گھنٹہ قبل وہ لڑکا یہاں آیا تھا۔ دروازہ پر کھڑا رہا۔ دروازے میں تالا لگا ہوا تھا۔ پھر پتہ نہیں وہ کیسے اندر پہنچ گیا۔ میں یہاں اندھیرے میں بیٹھا سب دیکھ رہا تھا۔ فوراً اٹھ کر یہاں دروازے کے قریب آیا دیکھا تو وہ وضو بنا رہا تھا۔ اس نے نماز پڑھی اور اُدھر مغربی دروازے سے نکل گیا۔ وہ دروازہ کھلا رہتا ہے۔''

میں نے حیرت کا اظہار کیا اور جلدی سے اپنے گھر کے قریب آیا اپنی گاڑی لی اور ایم ایل کینٹین کی طرف گیا۔ محمد علی سرائے، بھگوا گھر چوک اور سینٹرل ایونیو پر ہر جگہ تلاش کر لیا وہ مجھے کہیں نہیں ملا۔ جب اس کے ملنے کے کچھ آثار دکھائی نہیں دیئے تو میں

وہاں سے لوٹ آیا۔ ساحل صاحب کی دکان سے آگے بڑھا اور مومن پورہ چوک پر آ گیا۔ سویرے کے ساڑھے چار بج چکے تھے۔ ہوٹلیں کھل چکی تھیں۔ بہت سے لوگ ناشتہ کر رہے تھے، چائے پی رہے تھے۔ کڑاہیاں چولھوں پر چڑھ چکی تھیں۔ گرم گرم جلیبیاں، گلگلے، بھجئے اور سموسے کڑاہیوں سے نکل کر تھالوں میں جمع ہوتے اور تھوڑی دیر میں ہی غائب ہو جاتے میں ایک ایک ہوٹل کے قریب رک رک کر دیکھتا رہا کہ شائد تفضل کا کچھ پتہ چل سکے لیکن وہ کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ آدھے گھنٹے تک میں اس کونے سے وہاں جامع مسجد تک اور آگے محمد علی سرائے کی ہوٹلوں میں اسے تلاش کرتا رہا لیکن اس کا کچھ سراغ نہیں ملا۔ مایوس ہو کر میں وہاں سے لوٹ آیا اور برطانیہ ہوٹل میں چائے پینے کے لئے رک گیا کہ اس وقت امپریس مل سے آنے والے ورکروں کے لیے وہاں خاص طرح کی اسپیشل چائے بنائی جاتی تھی۔ اسے پینے کے لئے لوگ اس وقت خاص طور سے جمع ہوتے اور غالبًا پانچ لیٹر دودھ سے بنائی ہوئی وہ مصالحہ دار چائے آدھے گھنٹے میں ختم ہو جاتی تھی۔ میں جب وہاں پہنچا تو چائے تیار ہو چکی تھی اور امپریس مل سے چھوٹے ہوئے مزدور اپنی اپنی سائیکلوں پر وہاں پہنچنے لگے تھے۔ میں چائے پی رہا تھا تبھی میرے ایک پڑوسی اور قریبی شناسا جو امپریس مل میں کام کرتے تھے اتنی صبح مجھے وہاں دیکھ کر انھوں نے مجھ سے پوچھا: ”ارے ماسٹر صاحب، اتنی سویرے آج آپ یہاں؟“

میں نے کہا: ”ہاں چائے پینے چلا آیا۔ آج آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔“

انھوں نے کہا: ”ارے ہاں جو لڑکا آپ کے گھر آیا ہوا ہے ابھی میں نے اسے جمعہ تالاب کے قریب سے گذرتے ہوئے دیکھا۔“

اس کی اس بات کو سن کر میرے ہاتھ سے چائے کا کپ نیچے گر گیا۔ میں نے ان صاحب سے پوچھا: ”کدھر؟ کہاں؟ ادھر میں دو گھنٹے سے اسے ہی تلاش کر رہا ہوں۔“

اس شخص نے کہا: ''میں جمعہ تالاب کے بیچ کے راستے سے آ رہا تھا تو وہ مجھے کارپوریشن کے ذریعہ بنائی گئی سیڑھیوں کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے سوچا تفریح کے لئے یا صبح کی سیر کے لئے آیا ہوگا۔ اس کا دلکش چہرہ خوبصورت رنگ مستانہ وار چال اور متناسب بدن سب کی ہی توجہ اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔'' پھر اس شخص نے اپنے ایک دوست کی طرف دیکھا اور کہا: ''کیوں بے فاروق، تو نے بھی اس لڑکے کو دیکھا تھا نا؟'' اس شخص فاروق نے کہا: ''ہاں، اور میں نے ہی تم سے پوچھا تھا کہ کون لڑکا ہے۔ کتنا خوبصورت لڑکا ہے۔'' تب تم نے کہا تھا کہ یہ لڑکا وکیل نجیب ماسٹر کے گھر آیا ہوا ہے۔ بس ابھی کی بات ہے۔'' میں نے یہ سنا تو فوراً اپنی ہونڈا گاڑی پر بیٹھا۔ جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی جمعہ تالاب کی سمت روانہ ہوا۔ سڑکیں سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ آندھی طوفان کی طرح گاڑی چلاتے ہوئے میں جمعہ تالاب کے قریب پہنچ گیا۔ جمعہ تالاب کے بیچ کی سڑک کے کنارے کارپوریشن نے سیڑھیاں بنادی ہیں کہ وہاں بیٹھ کر تالاب کی خوبصورتی سے لوگ لطف اندوز ہوسکیں۔ میں نے کنارے گاڑی کھڑی کردی اور تیزی سے سیڑھیوں کی سمت روانہ ہوا۔ چند لوگ ورزش کر رہے تھے۔ بعض جاگنگ کر رہے تھے۔ تیز تیز چل رہے تھے۔ میں نے یہاں سے وہاں تک نظر دوڑائی سیڑھیوں پر چڑھ کر دیکھا لیکن تفضّل مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ پھر میں نے گاڑی اٹھائی اور گاڑی آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے تالاب کا چکّر لگانے لگا۔ جب میں بھالدار پورہ کے سامنے مولانا ناطق چوک کے کارنر پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں کچھ لوگ تالاب میں جھانک رہے تھے۔ میں نے اپنی گاڑی کنارے کھڑی کردی اور ایک شخص سے پوچھا: ''کیوں بھائی صاحب کیا بات ہے؟'' اس شخص نے کہا: ''ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک لڑکا آیا، لوہے کے اس پائپ پر چڑھ گیا۔ آگے پیچھے جھولنے لگا اور پھر اس نے کسی تیراک کی طرح ہوا میں ایک چھلانگ لگائی اور تالاب میں کود گیا۔ سڑک کی اُس طرف

میرا پان کا ٹھیلہ ہے۔ میں یہ پورا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہاں کچھ رکشے والے بھی کھڑے تھے انھوں نے بھی اسے تالاب میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ ہم دوڑ کر یہاں آئے لیکن اب تک وہ اوپر نہیں آیا ہے۔"

میں نے اس شخص سے پوچھا: "لڑکے نے کپڑے کیسے پہنے تھے؟"

انھوں نے کہا: "سفید شرٹ تھی اور سفید ہی پینٹ بھی تھی۔ بڑا خوبصورت لڑکا تھا۔"

ان کے منہ سے یہ باتیں سن کر میں کانپ کر رہ گیا۔ کافی لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ میرے دل میں ایک عجیب طرح کی دہشت پیدا ہوئی۔ پولیس کے آنے کا خوف پیدا ہوا میں نے جلدی سے گاڑی اٹھائی اور گھر کی جانب چل پڑا۔ اس وقت پوری طرح سویرا ہو چکا تھا۔ فجر کی نماز پڑھ کر نمازی لوٹ چکے تھے۔ کرانہ کی دکانیں اور ہوٹلیں کھل چکی تھیں۔ میں مومن پورہ چوک سے ہوتے ہوئے اپنے گھر واپس آ گیا۔ گاڑی کھڑی کی، اوپر پہنچا، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ جھانک کر نعمل کے کمرے میں دیکھا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تفضّل اپنے بستر پر بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں تو دریائے حیرت میں غرق ہو گیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میں اس کے قریب گیا۔ الگ الگ زاویے سے اسے دیکھا۔ وہ گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اس کے کپڑوں کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ کپڑے سوکھے ہوئے تھے۔ میں اپنے بیڈروم میں آیا، اہلیہ کو جگایا اور مدھم آواز میں پوچھا: "یہ لڑکا کب واپس آیا؟" انھوں نے حیران ہو کر پوچھا: "واپس آ گیا۔ کہاں ہے؟"

میں نے کہا: "نعمل کے کمرے میں اپنے بستر پر پڑا بے سدھ سو رہا ہے۔"

اہلیہ نے کہا: "میں نے تو نہ اسے جاتے دیکھا، نہ آتے دیکھا۔ اٹھے گا تو پوچھیں گے۔" میں بھی اس دوڑ بھاگ سے کافی تھک چکا تھا۔ اپنے پلنگ پر لیٹ گیا اور تھوڑی

دیر میں ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔

جب سو کر اٹھا تو دس بجے تھے۔ میں نے غسل کیا، ناشتہ کیا اور تفضل کو جو نعمل کے کمرے میں تھا اپنے قریب بلایا۔ میں نے اس سے کہا: ''رات کو کہیں چلے گئے تھے؟''

اس نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا: ''نہیں میں تو رات بھر اپنے بستر پر سوتا رہا۔''

میں نے کہا: ''رات کے ساڑھے تین بجے میں نے دیکھا تم اپنے بستر پر نہیں تھے۔ میں نے سب جگہ تمہیں تلاش کیا تم نہیں ملے، کہیں گئے تھے کیا؟''

لڑکے نے کہا: ''ارے ہاں رات میری آنکھ کھل گئی۔ گھبراہٹ ہو رہی تھی میں نے کچن سے پانی لے کر پیا اور اوپر ٹیریس پر چلا گیا تھا پھر تھوی دیر بعد وہاں سے آ کر سو گیا۔''

''ٹیریس کے دروازے کا قفل کھلا ہوا تھا؟''

''ہاں دروازہ کھلا تھا میں اوپر چلا گیا۔ وہاں ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ دور دور کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ کچھ دیر تک میں وہیں ایک سیڑھی پر بیٹھا رہا۔ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ پھر نیند کا احساس ہوا تو میں نیچے آیا اور اپنے بستر پر سو گیا۔''

میں نے اندر جا کر اہلیہ سے پوچھا: ''رات میں ٹیریس کا دروازہ بند نہیں کئے تھے کیا؟''

انھوں نے کہا: ''دروازہ تو بند تھا۔ کیوں کیا ہوا؟''

میں نے انہیں بتایا کہ تفضل کا کہنا ہے کہ وہ رات کو ٹیریس پر چلا گیا تھا۔''

اہلیہ نے اپنے کمرے میں ٹنگی ہوئی چابی نکالی اور مجھے بتایا کہ چابی تو یہاں ہے۔ میں نے چابی لی اور ٹیریس کی سیڑھیوں پر پھر سے چڑھا۔ میں نے دیکھا کہ دروازے میں تالا بدستور لگا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر ٹیریس کے دروازے میں تالا لگا ہوا تھا تو

یہ اوپر چڑھا کیسے؟ اگر یہ اوپر تھا تو نیاز لیڈر نے جس لڑکے کو مسجد میں دیکھا وہ کون تھا؟ مل کے جس ورکر نے اسے جمعہ تالاب کے پاس دیکھا تھا وہ کون تھا، تالاب میں جس لڑکے نے چھلانگ لگائی وہ کون تھا؟ میں بڑی الجھن میں تھا۔ تفضّل کریم کی شخصیت میرے لئے ایک معمّہ بن گئی تھی۔ میں نے اس خیال کو دماغ سے جھٹک دیا اور نیچے کمرے میں آیا اور تفضّل کریم سے کہا: ''بیٹا، تمہارے لئے خوشخبری ہے۔ تمہارے دادا جان نے جو دولت چھپائی ہے اس کا پتہ مل گیا ہے۔'' وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا اور کہا: ''انکل جی بتایئے وہ کہاں ہے؟''

''تمہاری کوٹھی کے پیچھے جو باغ تھا وہاں کوئی پیپل کا درخت ہے؟''

اس نے جلدی سے کہا: ''ہاں باغ کے مشرقی کونے میں پیپل کا درخت ہے۔''

میں نے کہا: ''بس ہمیں تمہارے دادا جی کی چھپائی ہوئی دولت وہیں ملے گی۔''

پھر میں نے مثنوی کا وہ حصہ اسے دکھایا اور حرفوں کو جمع کر کے جملہ بنایا اور ان جملوں سے بنی پوری عبارت اُسے بنا کر بتادی۔

لڑکے نے کہا: ''بالکل صحیح ہے یہی بات دادا جان نے نظم میں چھپائی تھی۔ ہم لوگ آج ہی دہلی کے لئے نکل پڑتے ہیں کہیں برف پگھل نہ جائے۔''

میں نے کہا: ''برف کیسے پگھلے گی۔ فرج میں کافی ٹھنڈک ہے تم برف کی فکر مت کرو۔''

اس کے چہرے پر ایک عجیب سی خفت کے آثار ابھرے، یوں لگا جیسے وہ غیر شعوری طور پر کوئی بات کہہ گیا ہو۔ میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹائی اور اس سے کہا: ''یہاں سے چار بجے ایک فاسٹ ٹرین ہے اسی سے ہم دہلی چلتے ہیں۔ میں نے IIIA/C میں دو ٹکٹیں تمل ناڈو ایکسپریس کی بک کروالیں۔ اس نے اپنا سامان لے لیا۔ میں نے بھی اپنا مختصر سا سامان ایک سوٹ کیس میں ڈالا اور تین بجے ریلوے

اسٹیشن کی سمت روانہ ہو گئے۔

ٹرین ٹھیک وقت پر آ گئی۔ ہم نے اپنے کمپارٹمنٹ میں جگہ پکڑ لی اور ٹرین وہاں سے روانہ ہوئی۔ صبح سات بجے ٹرین دہلی پہنچ گئی۔ ہم ریلوے اسٹیشن سے باہر آئے اور ٹیکسی کر کے مٹیا محل تفضّل کی کوٹھی کی سمت روانہ ہوئے۔ آدھے گھنٹے میں ہماری ٹیکسی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئی۔ واقعی بڑی عظیم الشان حویلی تھی لیکن وقت کی گردش اس کی ساری خوبصورتی اور وقار کو غارت کر چکی تھی۔ وسیع و عریض قطعہ زمین پر بنی ہوئی اس کوٹھی پر برسوں سے رنگ و روغن نہیں چڑھایا گیا تھا۔ جگہ جگہ سے پلاسٹر اکھڑ چکا تھا۔ موسموں کی مار سہتے سہتے دروازوں کے پٹ ڈھیلے پڑ گئے تھے اور بدرنگ ہو چکے تھے۔ ٹیکسی سے اتر کر ہم کوٹھی کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئے چند بچے وہاں کھیل رہے تھے۔ تفضّل کو دیکھ کر وہ اس کی طرف دوڑے اور چلّانے لگے "بھائی جان آ گئے۔ بھائی جان آ گئے۔"

ہم آگے بڑھے تبھی دروازے کا پردہ ہٹا۔ کسی خاتون نے جھانک کر ہماری طرف دیکھا۔ تفضّل کے ساتھ مجھے دیکھ کر پردہ گرا دیا گیا۔ تفضّل نے کہا: "میری والدہ تھیں۔" پھر مجھ سے کہا: "انکل آپ اس پوشیدہ دولت کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہیں اس کی ذرا بھی بھنک کسی کو لگ گئی تو طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔ بھوکے بھیڑیوں کی طرح چھینا جھپٹی شروع ہو جائے گی۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے جیسا تم کہو گے ویسا ہی میں کروں گا۔"

دروازے پر پہنچ کر تفضّل نے آواز لگائی: "امی جان، میں آ گیا ہوں۔ میرے ساتھ ناگپور والے انکل بھی ہیں۔"

اندر سے نسوانی آواز آئی: "آ جاؤ۔"

ہم اندر کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ کوٹھی کا ایک بڑا ملاقاتی کمرہ تھا۔ کافی کشادہ

تھا اور اس کمرے کی پشت پر چاروں طرف دروازے تھے جو الگ الگ کمروں میں کھلتے تھے۔ اس کمرے میں پرانے طرز کے شیشم کی لکڑی سے بنے ہوئے صوفے رکھے ہوئے تھے۔ صوفوں پر نہ گدے تھے نہ غلاف۔ ان پر جگہ جگہ گرد و غبار جمع ہوا تھا ایسا لگتا تھا کہ کچھ صوفوں کو برسوں سے استعمال ہی نہیں کیا گیا ہے۔ تفضّل نے ایک صوفے کو سامنے ٹنگے ہوئے تولئے سے جھٹک کر صاف کیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا: ''میں صوفے پر بیٹھ گیا اپنا سوٹ کیس ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے محسوس کیا دروازوں سے کچھ لوگ مجھے پر تجسس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں اپنی جگہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد تفضّل نے جگ اور گلاس میں پانی لا کر مجھے دیا۔ میں نے پانی پی لیا تب تفضّل نے کہا: ''انکل میں چائے لا رہا ہوں پھر میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھادوں گا۔''

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے۔ No Problem''

تھوڑی دیر میں خوبصورت چائے کی پیالیوں میں خوشبودار اور خوش ذائقہ چائے آ گئی۔ میں نے اطمینان سے چائے پی اور تفضّل کے ساتھ چلتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں دروازے کی دائیں جانب ایک بڑا بھاری پلنگ بچھا ہوا تھا اُس پلنگ پر کچھ پرانے سامان اور برتن وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا برسوں سے اس پلنگ کو کسی نے استعمال نہیں کیا تھا وہیں بائیں جانب ایک چھوٹا نئے طرز کا پلنگ تھا جس پر گدہ چادر تکئے وغیرہ ترتیب سے رکھے ہوئے تھے پلنگ کی پچھلی جانب ایک ٹیبل تھا۔ وہیں پشت کی جانب باتھ روم تھا۔ تفضّل نے مجھ سے کہا: ''انکل آپ یہاں آرام کریں باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس کھولا۔ لنگی تولیہ نکالا، باتھ روم میں جا کر اچھی طرح غسل کیا اور پلنگ پر آ کر لیٹ گیا۔ سفر کی تھکان تھی تھوڑی دیر میں ہی سو گیا۔

آنکھ کھلی تو 12 بج رہے تھے۔ ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہوا۔ کپڑے پہنے اور

ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں پر تین لوگ پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص تو کافی بھاری بھرکم تھا۔ گھنگھریالے کھچڑی بال تھے، چوڑا چہرہ تھا اور بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ سفید بنگالی کرتا اور سفید پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے چہرے پر عجیب طرح کی سختی اور بے رخا پن نظر آرہا تھا۔ دونوں پیروں کو لمبا کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کے بیٹھا تھا۔ دوسرا شخص اس کی بغل میں بیٹھا تھا۔ چھریرے بدن، درمیانی قد کا آدمی تھا عمر 40 سے 45 کے درمیان کی تھی۔ اچھی طرح شرٹنگ کئے ہوئے تھا۔ اس کے بال ترتیب سے جمے ہوئے تھے، داڑھی مونچھیں صاف تھیں نیم بیضوی اس کا چہرہ تھا آنکھوں سے شاطرانہ پن چھلکا پڑ رہا تھا۔ تیسرا شخص کنارے بیٹھا ہوا تھا جو کافی تنومند تھا۔ لمبوترا اس کا چہرہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ ایسے بال جنھیں کنگھے سے جمانے کی اور مانگ نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ داڑھی مونچھیں صاف تھیں ہلکے نیلے رنگ کا پٹھانی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر مستقل نظر آتی تھی۔ تفضّل بھی وہیں دوسرے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں جب ڈرائنگ روم میں آیا تو تفضّل اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے سلام کیا۔ میں نے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کیا۔ اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ تفضّل نے بھاری بھرکم شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”انکل یہ میرے والد مرزا فیصل کریم بیگ اور یہ میرے ماموں نصرت عظیم الدین خاں صاحب ہیں اور یہ میرے خالو عادل اشتیاق نعیم صاحب ہیں۔ ان کی بازار میں جوتے چپلوں کی بڑی دکان ہے۔ پھر اس نے تینوں کی طرف دیکھ کر کہا: ”یہ دادا جی کے دوست ہیں جناب وکیل نجیب صاحب ناگپور سے یہاں تشریف لائے ہیں۔“

تینوں حضرات نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ان سے مصافحہ کیا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

لڑکے کے والد نے مجھ سے کہا: ”ہم نے کبھی آپ کو دیکھا نہیں۔ آپ یہاں

کس مقصد سے آئے ہیں؟"

میں ان کا یہ سوال سن کر گھبرا گیا۔ میں نے ایک نظر تفضّل پر ڈالی اور کہا: "حضرت سے میرے مراسم تھے۔ خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی صاحب کے ساتھ ان سے کئی بار یہاں ملاقات بھی کر چکا ہوں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے ان سے ادبی لائن کے تعلقات تھے۔"

"ٹھیک ہے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ ہمارے لئے بڑی پریشانیاں کھڑی کر کے گئے ہیں۔ آپ کو کچھ ان کے تعلق سے معلومات ہوں تو ہمیں بتائیں۔"

میں نے کہا: "میری ان سے ادب کے موضوع پر گفتگو ہوتی تھی گھریلو حالات کے متعلق انھوں نے کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ ابھی یہ بچہ ناگپور آیا تو میں بھی ماتم پرسی کے لئے یہاں چلا آیا۔ بس اس کے علاوہ یہاں آنے کا کچھ اور مقصد نہیں ہے۔"

لڑکے کے ماموں نے کہا: "حضرت آپ آئے آپ کا شکریہ۔ یہاں بڑے عجیب معاملات چل رہے ہیں۔ آپ کو کچھ تکلیف ہو تو اس کا برا نہ مانیں۔ آپ اتنی دور سے یہاں آئے ہیں اس کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ ٹھیک ہے ہم چلتے ہیں۔ دوپہر میں دستر خوان پر آپ سے ملاقات ہوگی۔" اتنا کہہ کر تینوں اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ تفضّل میرے قریب آیا اور مجھ سے کہا: "آپ ان کی باتوں کا برا نہ مانیں اور آج رات ہمیں جو کام کرنا ہے کر لیں۔ خاص طور سے بینک کا پیسہ ادا کرنا بہت ضروری ہے۔"

ہماری یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ پچھلے دروازے سے ایک خاتون ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ ان کے ساتھ آٹھ نو سال کی ایک بچی بھی تھی۔ بچی کی شکل تفضّل سے بے حد ملتی جلتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ خاتون تفضّل کی والدہ ہوں گی اور لڑکی تفضّل کی بہن ہوگی۔

خاتون نے مجھے سلام کیا اور دوسرے صوفے پر ایک طرف بیٹھ گئیں۔ لڑکی بھی ان کے بائیں طرف بیٹھ گئی۔ تفضّل کی والدہ نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا: ''بھائی صاحب آپ نے بڑی زحمت کی۔ یہاں تشریف لائے۔ میرے بچے کو اپنے گھر میں اپنے ساتھ رکھا۔ اسے لے کر مختلف افراد کے پاس گئے۔ اب جو اہم کام کرنا ہے آپ نہایت احتیاط سے کریں اور ہمیں اس اذیت سے چھٹکارہ دلائیں جنھیں ہم عرصہ دراز سے سہتے چلے آرہے ہیں۔''

میں نے کہا: ''آپا آپ بے فکر رہیں مجھے امید ہے کہ آپ کی پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ ہم سراغ پا چکے ہیں۔ بس عمل کی دیر ہے۔''

''جی بہت اچھا۔ آپ کو کہیں جانا ہو تو چلے جائیں ظہر بعد یہیں رہیں۔ آپ کے لئے کھانا تیار کیا جا رہا ہے۔''

''جی بہتر ہے۔'' میری بات سن کر وہ اٹھ کر اسی دروازے کی طرف چلی گئیں جہاں سے آئی تھیں۔ میں نے تفضّل سے کہا: ''بیٹا، چلو ڈاکٹر خوشحال زیدی صاحب سے ملاقات کرتے ہیں۔''

تفضّل نے کہا: ''انکل وہاں جانے اور وہاں سے آنے میں وقت لگ جائے گا۔ چلئے میں آپ کو کوٹھی کی پشت کا حصہ دکھا دیتا ہوں۔''

میں اس کے ساتھ باہر آیا۔ ہم اپنی دائیں طرف کے Passage سے ہوتے ہوئے پشت کی طرف کے باغ میں آ گئے۔ باغ ویران پڑا ہوا تھا۔ بیچ میں ایک حوض بنا ہوا تھا جو اب پوری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ اس میں فوارہ لگا ہوا تھا جس کے صرف نشانات باقی تھے۔ ایک طرف پلاسٹک فائبر کی دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں ہم دونوں ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں کنکھیوں سے پیپل کے درخت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تفضّل دھیمی آواز میں مجھے درخت کے متعلق بتا رہا تھا۔ درخت کے بیج اور پرندوں کی بیٹ سے درخت

کے نیچے کا حصہ اٹا پڑا تھا۔ درخت کے نیچے ایک دو چمگادڑ بھی مرے پڑے ہوئے تھے۔ ایک عجیب طرح کا تعفن وہاں سے اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہم نے اپنی بات جاری رکھی اور اشاروں میں یہ بھی طئے کرلیا کہ رات کو کون سے حصے کی کھدائی کرنی ہے۔ میں نے تفضّل کو زمین کھودنے کا سامان تیار رکھنے کو کہا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر ہم وہاں سے اٹھ کر میرے کمرے میں آ گئے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ساتھ ہی بیٹھ کر کھایا۔ میں نے دیکھا کہ تفضّل کے والد کی حالت بڑی غیر ہو گئی تھی۔ معمول کے مطابق شراب کی مقدار نہ ملنے سے شرابیوں کی جو کیفیت ہوتی ہے ویسا ہی حال تفضّل کے والد کا تھا۔ بے رغبتی سے انھوں نے کھانا کھایا اور پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تفضّل کا ماموں تھوڑی دیر ڈرائنگ روم میں ہمارے ساتھ بیٹھا رہا۔ پھر وہ بھی اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے تفضّل سے کہا کہ میں ذرا دہلی اردو اکادمی کے دفتر سے ہو کر آتا ہوں۔ وہاں امنگ میں اور ایوانِ اردو میں میری تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اسٹاف کے لوگوں سے مل کر آجاتا ہوں۔''

تفضّل نے کہا: ''ٹھیک ہے انکل آپ جایئے میں زمین کھودنے کا سارا سامان آپ کے کمرے میں پہنچا دیتا ہوں۔ وہیں پچھلے دروازے سے نکل کر ہم پیپل کے درخت کے پاس کھدائی کا کام کریں گے۔''

ساری باتیں طئے ہو جانے کے بعد میں کوٹھی سے نکل کر آیا۔ کشمیری گیٹ پہنچا۔ امنگ کے مدیر اور اکادمی کے چیئرمین سے ملاقات کی اور ان کو بتایا کہ یونہی سیر و تفریح کے لئے دہلی آیا ہوں۔

مغرب کے بعد میں کوٹھی میں واپس آ گیا۔ کمرے کی لائٹ جلائی تو میری نظر میرے سوٹ کیس پر گئی مجھے لگا کہ کسی نے میرے سوٹ کیس کو کھولا ہے۔ کچھ کپڑے سوٹ کیس کے باہر بھی لٹکتے نظر آرہے تھے۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر سوٹ کیس کو

کھول کر دیکھا۔ سارے کپڑے بے ترتیب رکھے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی ایک ایک چیز کو دیکھا۔ ساری چیزیں موجود تھیں صرف میری ڈائری غائب تھی۔ اُس ڈائری میں میں نے راستے کے سفر کے کچھ واقعات لکھے تھے۔ باقی کسی چیز کی تفصیل نہیں تھی۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا لیکن وہ ڈائری مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ لائف انشورنس کارپوریشن کی ڈائری تھی جس پر میرا نام چھپا ہوا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی وہ ڈائری مجھے LIC کے فیلڈ آفیسر جناب ایم ای آر صدیقی صاحب نے دی تھی۔ کافی دیر تک میں اس بات پر حیران ہوتا رہا کہ کون شخص ہو سکتا ہے جس نے میرے سامان کی تلاشی لی۔ اُسے کس چیز کی تلاش تھی۔ بہت دیر تک میں اس بات پر اور دن بھر کے واقعات پر غور کرتا رہا۔ میں نے آج دن بھر میں دیکھا کہ کوٹھی کے گوشے گوشے میں ایک عجیب طرح کی وحشت ٹپکتی محسوس ہوتی تھی اور کوٹھی میں رہنے والا ہر آدمی سہما ہوا، ڈرا ہوا، خوفزدہ معلوم ہوتا تھا۔ پتہ نہیں یہ ان حالات کا اثر تھا جس سے کوٹھی کے لوگ گذر رہے تھے یا کوٹھی کے ہاتھ سے نکل جانے کا خوف تھا جو کوٹھی میں رہنے والے ہر آدمی کے چہروں سے بلکہ پورے وجود سے چپک کر رہ گیا تھا۔

رات سونے سے قبل تفضّل میرے کمرے میں آیا۔ مجھے اس نے بتایا کہ زمین کھودنے کی ساری ضروری چیزیں حوض کے اندر چھپا کر رکھ دی ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ رات کے دو بجے وہ پچھلے دروازے سے میرے کمرے میں آئے گا اور دونوں مل کر جگہ کو کھودیں گے۔

میں نے اس کی ہر بات کا اقرار کیا اور کہا کہ میں جاگتا رہوں گا۔ یہ سن کر وہ چلا گیا اور اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

رات کے دو بجے ہوں گے کہ میری آنکھ کھل گئی۔ باغ کی طرف سے زمین کے کھودنے کی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں جلدی سے تیار ہوا۔ پچھلے دروازے کو کھول

کر پیپل کے درخت کی طرف دیکھا۔ وہاں بھیانک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں دو سائے مجھے حرکت کرتے نظر آئے۔ میں حیران ہوا۔ پھر ہمت کر کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ پیپل کے درخت کے قریب پہنچا۔ تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ کالے نقاب میں پوشیدہ زمین کھودنے والے دونوں لوگ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے دیکھا ایک تو تفضّل کریم تھا اور دوسری اس کی والدہ تھیں۔ مجھے دیکھ کر تفضّل کی والدہ نے کہا: ''ہم آپ کو زحمت دینا نہیں چاہتے تھے اس لئے ہم نے خود ہی یہ کام شروع کر دیا۔''

میں نے کہا: ''اگر میری ضرورت نہ ہو تو میں ابھی اس کوٹھی سے چلا جاؤں۔ مجھے دوسروں کے معاملات میں پڑنے کا شوق نہیں ہے۔''

تفضّل نے کہا: ''انکل آپ برا نہ مانیں۔ بہ خدا ہمارا سوچنا ایسا نہ تھا۔ ہم تو چاہتے تھے کہ آپ کو تکلیف میں ڈالے بغیر یہ کام انجام دے لیں۔ اب آپ آ ہی گئے ہیں تو مہربانی کر کے اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔''

ہماری یہ باتیں چل رہی تھیں اور ہم احتیاط سے ادھر اُدھر دیکھ بھی لیتے تھے کہ کوئی ہماری حرکت کو دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ میرا مقصد ان کی مدد کرنا ہے سو میں ان کی مدد کروں آگے یہ جانیں اور ان کا کام۔ میں دس فیصد کمیشن کے لالچ میں تو یہاں آیا نہیں تھا۔ مل گیا تو سمجھوں گا مالِ غنیمت ہاتھ لگ گیا۔ ہم تینوں نے مل کر زمین کے مخصوص حصے کو کھودنا شروع کیا۔ ابھی ہم نے دو منٹ ہی کھدائی کی تھی کہ کوٹھی کے ایک کونے سے کوئی شخص نکل کر باغ میں آتا ہوا دکھائی دیا۔ ہم نے اپنے ہاتھ روک لئے اور تیزی سے پیپل کے تنے کے پیچھے چھپ گئے۔ تھوڑی دیر میں ہم اس شخص کو پہچان گئے۔ وہ تفضّل کے خالو اشتیاق نعیم تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبا سا لوہے کا پائپ تھا اور نیچے ایک گول سی چکری لگی ہوئی تھی۔ باغ میں آنے کے بعد انھوں نے ایک جگہ

رک کر چاروں طرف دیکھا، جب انھیں اندازہ ہو گیا کہ وہاں آس پاس کوئی موجود نہیں ہے تو وہ اپنے ہاتھ کے پائپ کو زمین پر رگڑتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ باغ کے تھوڑے تھوڑے حصے پر پائپ کے نچلے حصے کو احتیاط سے رگڑ رہے تھے اور اپنے ہاتھ کے پائپ کو کان سے لگا کر کچھ آواز بھی سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا یہ عمل پانچ منٹ چلا ہو گا کہ اچانک تفضّل نیچے بیٹھ گیا اور اس نے سامنے پڑے ہوئے چمگادڑ کو اٹھا لیا اور پوری طاقت سے اپنے خالو کی طرف پھینک دیا۔ تفضّل نے کمال ہنر مندی سے مردہ چمگادڑ ان کی طرف پھینکا تھا۔ وہ سیدھے جا کر ان کے منہ پر "چپ" سے پڑا۔ لوہے کا پائپ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ انھوں نے حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے میں انھیں کچھ نظر نہیں آیا وہ جلدی سے نیچے جھکے اور تیزی سے انھوں نے وہ پائپ اٹھا لیا۔ اسی وقت تفضّل نے مٹی کا ایک بڑا ڈھیلا اٹھایا اور پوری قوت سے ان کی طرف پھینک دیا۔ مٹی کا ڈھیلا ان کے سینے پر جا کر لگا، وہ خوف سے زمین پر چت گر پڑے، پھر انتہائی پھرتی سے اٹھے اور لوہے کا پائپ لے کر جس طرف سے آئے تھے اُدھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ چپ چاپ دم سادھے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے تفضّل سے کہا:

"اس وقت یہ کام کرنا مناسب نہیں ہے۔ کل ہم یہ کام کریں گے۔"

تفضّل نے کہا: "نہیں انکل یہ کام ابھی کرنا ضروری ہے۔ کل بات پھیل جائے گی، ہم کچھ دیر یہاں چھپ کر بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر پھر سے کوئی ادھر نہیں آیا تو ہم اپنا کام شروع کر دیں گے۔"

تفضّل کی والدہ نے بھی یہی بات کہی اور ہم سب پیپل کے درخت کے موٹے تنے کے پیچھے چھپ کر بیٹھے رہے۔ آدھے گھنٹے تک ہم چپ چاپ وہاں بیٹھے رہے پھر پہلے تفضّل نے، بعد میں میں نے پھر آخر میں تفضّل کی والدہ نے کھدائی کرنی شروع

کی۔ جب تفضّل کی والدہ کھدائی کر رہی تھیں تو ان کا پکاس کسی دھات کی چیز سے ٹکرایا ہلکی سی آواز ہوئی۔ ان کا چلتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ پھر سے سب نے احتیاط سے چاروں طرف دیکھا، جب کوئی نظر نہیں آیا تو سب مل کر احتیاط سے اس جگہ کو کھودنے لگے جہاں سے کسی دھات کے برتن کے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ دس پندرہ منٹ کی کھدائی کے بعد ہمیں وہاں لوہے کی ایک پرانے زمانے کی مضبوط تجوری نظر آئی۔ ہم نے اُسے باہر نکالا۔ اس میں مضبوط تالا لگا ہوا تھا۔ اسے نکال کر زمین پر رکھ دیا۔ جلدی جلدی گڑھے کو مٹی سے بھر دیا۔ زمین برابر کر دی۔ اس پر پتے اور پیپل کے پھل پھیلا دیئے۔ تفضّل نے اپنی والدہ سے کہا: ''اسے کہاں رکھیں۔''

تفضّل کی والدہ نے کہا: ''اسے بھائی صاحب کے کمرے میں رکھ دو۔ اپنے کمرے میں رکھنے میں خطرہ ہے۔ تمہارے والد نے دیکھ لیا تو آفت کھڑی ہو جائے گی۔''

میں نے اور تفضّل نے مل کر اس تجوری کو اٹھایا۔ تجوری کافی وزنی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے ہم اسے میرے کمرے میں لائے اور ایک کونے میں چھپا کر رکھ دیا اس کے اوپر پرانے رکھے ہوئے کچھ برتن رکھ دیئے۔ تفضّل کی والدہ اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ تفضّل بھی تھوڑی دیر میں وہاں سے چلا گیا۔ اس وقت چار بج چکے تھے۔ پسینے سے میرے پورے کپڑے گیلے ہو گئے تھے۔ کمرہ کا پنکھا چل رہا تھا۔ ہوا لگنے سے مجھے ٹھنڈک کا فرحت بخش احساس ہوا۔ میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ اب اس کوٹھی پر جو بربادی کے سائے لہرا رہے ہیں اس سے نہ صرف کوٹھی کو بلکہ یہاں کے مکینوں کو بھی نجات مل جائے گی۔

دوسرے دن صبح تفضّل نے مجھے اطلاع دی کہ امی نے مجھے لوہا کاٹنے کی آری لانے کو کہا ہے۔ اس کے ذریعہ ہم تجوری کے تالے کو کاٹ ڈالیں گے۔ یہ کام رات میں

کریں گے۔ میری والدہ، میں اور آپ۔ ہم صرف تین لوگ ہی رہیں گے۔''

''تمہارے والد کو خبر نہ ہونے پائے۔'' میں نے کہا۔

تفضّل نے کہا: ''وہ رات کو دارو پی کر سوتے ہیں تو انہیں کچھ ہوش نہیں رہتا۔''

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے تم آری لا کر میرے کمرے میں رکھ دینا۔ رات کو ہم اسے کاٹنے کی کوشش کریں گے۔'' یہ سن کر تفضّل وہاں سے چلا گیا۔ میں بھی تیار ہو کر باہر نکل گیا۔ دہلی کے تاریخی مقامات دیکھنے نکل پڑا۔ جامع مسجد کو دیکھنے کے بعد جب میں جامع مسجد کی پائریوں سے نیچے اتر رہا تھا تو راستے میں مجھے تفضّل کے خالو مل گئے۔ بڑے تپاک سے مجھ سے ملے اور ضد کر کے مجھے کھانا کھلانے وہیں کریم ہوٹل میں لے گئے۔ ہم نے کھانا کھایا اور پھر وہ مجھے اپنے ساتھ اپنی دکان میں لے آئے۔ دکان میں دو تین لڑکے کام کر رہے تھے انھوں نے مجھے اپنے کاؤنٹر کے پاس بیٹھا دیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں پھر مجھ سے رازدارانہ لہجے میں بولے: ''تفضّل کے دادا نے بہت سے قیمتی زیورات کوٹھی میں کہیں چھپا کے رکھے ہیں۔ مرزا صاحب کو بھی اس کی تلاش ہے۔ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ دادا نے پوتے کو بتا دیا ہے کہ مال کہاں چھپا ہوا ہے۔ سب کو اس کی تلاش ہے۔ گھر کے کچھ لوگ یہ بھی سمجھ رہے ہیں کہ اسی مال کو تلاش کرنے کے لیے تفضّل آپ کو ناگپور سے یہاں لایا ہے۔ اگر آپ کو کچھ علم ہو تو مجھے رازدار بنا لیجیے ہم لوگ آپس میں مال تقسیم کر لیں گے۔''

میں نے کہا: ''میرا دلّی آنا محض ایک اتفاق ہے۔ یہاں آپ کے گھر میں کیا چل رہا ہے مجھے اس سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔ ہاں اگر مجھے یہاں رہتے ہوئے کسی بات کا پتہ چلا تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔''

''خیر آپ بتائیں نہ بتائیں لیکن دولت مرزا صاحب کے ہاتھ لگی تو وہ بھی برباد ہو جائے گی۔ رات دن وہی چیز ان کے دماغ میں گھومتی رہتی ہے۔''

میں نے کہا: ''مجھے ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں تو ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابوں کی تلاش میں یہاں آیا تھا لیکن وہ بھی یہاں موجود نہیں ہیں۔ اچھا مجھے اجازت دیجئے مجھے ایک دو جگہ اور جانا ہے۔'' اتنا کہہ کر میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور سامنے ہوٹل سے چائے لانے کے لئے لڑکے کو آواز دی۔ جب میں اپنی جگہ کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ میری گمشدہ ڈائری ان کے کاؤنٹر کے ڈرار میں رکھی ہوئی تھی۔ انھیں بھی اس بات کا احساس ہوا انھوں نے جلدی سے ڈرار بند کر دیا۔ چائے آنے کے بعد میں نے چائے پی اور وہاں سے اُٹھ کر باہر آ گیا اور دن بھر دہلی کے مختلف مقامات کی سیر کرتا رہا۔ رات کو دیر سے لوٹا۔ اپنے کمرے میں جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ جلد ہی نیند میں ڈوب گیا۔ رات کو پتہ نہیں کتنا بجا تھا۔ پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ تفضّل اپنی والدہ کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے اندر آ گئے۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کونے میں رکھی ہوئی تجوری میں لگے تالے کو آری سے کاٹنے لگے، پہلے تفضّل نے آری چلائی، تھوڑی دیر میں آری کی بلیڈ ٹوٹ گئی۔ پھر میں نے دوسری بلیڈ کو آہستہ آہستہ چلانا شروع کیا۔ وہ آری بھی ٹوٹ گئی۔ تیسری بلیڈ سے تالے کو کاٹنا شروع کیا اور تالے کی کڑی کٹ گئی۔ ہم نے اسے الگ کیا۔ تالا تجوری کے ہک سے باہر نکل گیا۔ سارے لوگوں کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ میں نے تجوری کے ہینڈل کو ہاتھ سے پکڑا اور طاقت لگا کر کھینچا۔ لیکن برسوں کی مٹی میں دبی ہوئی تجوری کے قبضے میں زنگ لگ چکا تھا۔ ہلکی سی چرمراہٹ کی آواز ہوئی۔ میں نے سر میں لگانے کا ناریل کا تیل تجوری کے قبضے میں انگلی سے ٹپکایا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر سے ہینڈل کو احتیاط سے اپنی جانب کھینچا۔ اس بار تجوری کا پٹ کھلتا چلا گیا۔ بلب کی روشنی تجوری میں اندر داخل ہوئی۔ ہم نے دیکھا کہ تجوری کے الگ الگ خانوں میں زیورات رکھے ہوئے تھے۔ سونے کے

زیورات جن میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ بلب کی مدھم روشنی میں بھی وہ جھلمل جھلمل چمک رہے تھے۔ تفضّل کی والدہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک زیور جو گلے میں پہننے کا بہت خوبصورت جڑاؤ ہار تھا۔ باہر نکال لیا اور تفضّل کی والدہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ حیران نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔ پھر انھوں نے اپنا ڈوپٹہ نکال لیا اور تجوری کے سارے زیورات اس میں رکھ لئے اس میں ایک تھیلی بھی تھی جو سرخ رنگ کے کپڑے سے بنی ہوئی تھی جس کا منہ ایک ریشمی ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ انھوں نے ڈوپٹے کی پوٹلی باندھ لی، جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور تفضّل سے کہا: ''چل بیٹا چلتے ہیں۔ پہلے باہر جھانک کر دیکھ لے کوئی موجود تو نہیں ہے۔''

تفضّل نے پچھلے دروازے کو ہلکا سا کھولا جھانک کر دیکھا اور اپنی امی سے کہا: ''امی چلئے کوئی بھی نہیں ہے۔''

ماں بیٹے دونوں جلدی سے کمرے سے نکل گئے۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تجوری کو پھر سے پرانے برتنوں میں چھپا دیا اور اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد تفضّل میرے کمرے میں آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میرا کام ختم ہو گیا ہے میں اب اپنے شہر چلا جاتا ہوں۔''

اس نے کہا: ''نہیں انکل آپ کو ہمارے گھر کے حالات سلجھا کر ہی جانا ہے۔''

پھر اس نے اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جب ہاتھ باہر نکالا تو اس میں سونے کا ہیرے جڑا ہوا ایک ہار تھا۔ اس نے وہ ہار مجھے دیتے ہوئے کہا: ''اسے بیچنا ہے۔ یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔ نہ میں کر سکتا ہوں نہ میری والدہ۔''

میں نے کہا: ''بیٹا یہ بڑی مصیبت کا کام ہے۔ یہ کام کوئی مقامی آدمی ہی کر سکتا ہے اور وہ بھی ایسا شخص جس کی صرافہ بازار میں جان پہچان ہو۔ جس پر اعتبار و اعتماد ہو

یہ ایک ہار ہی لاکھوں روپیوں کی مالیت کا ہے۔اس کی صحیح قیمت معلوم کرنا اور صحیح قیمت میں فروخت کرنا جان جوکھم میں ڈالنے کا کام ہے۔''

تفضّل نے کہا: ''انکل آپ کسی بھی طرح اسے فروخت کروادیں اور ہماری کوٹھی کو بینک سے چھڑوادیں۔ وقت بہت کم بچا ہے۔کہیں برف پگھل نہ جائے۔''

میں نے کہا: ''تم وقت کی فکرمت کرو اور اگر برف پگھل بھی گئی تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ برف کے پگھلنے سے تم کیوں گھبراتے ہو۔ اس سلسلے میں میرے نزدیک ایک ہی آدمی ہے جو یہ کام کرسکتا ہے یا کرواسکتا ہے اور وہ ہے ڈاکٹر خوشحال زیدی صاحب۔''

تفضّل نے کہا: ''انہیں بھروسے میں لینا مناسب ہوگا!''

''اور کوئی دوسرا آدمی ملنا مشکل ہے اور وہ اس بابت کچھ باتیں جانتے بھی ہیں لہٰذا انہیں ساتھ لینا مناسب ہوگا۔ ہم انہیں یہی بتائیں گے کہ یہی ایک قیمتی زیور دستیاب ہوا ہے۔''

تفضّل نے کہا: ''چلیئے پھر جلدی کیجئے۔ یہ کام ایک دودن میں ہمیں انجام دے لینا ہے۔''

''ٹھیک ہے چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ میں نے زیور اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا اور ہم آٹو رکشہ سے اوکھلا کی سمت روانہ ہوئے۔ پتہ ہم دونوں کو ہی معلوم تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ زیدی صاحب گھر میں ہی تھے۔ انھوں نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہماری اضطرابی کیفیت دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ہم کسی اہم معاملے میں گفتگو کرنے آئے ہیں۔ انھوں نے کہا: ''چلو بک ڈپو میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' مکان کے پیچھے ہی ان کا بک ڈپو اور پرنٹنگ پریس ہے۔ ہم وہاں آکر ان کے کیبن میں بیٹھ گئے۔ دروازہ میں نے اندر سے بند کرلیا اور کہا: ''زیدی

صاحب کسی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے میں صرف اہم معاملے کی بات آپ سے کرتا ہوں کہ تفضّل کے دادا کی نشاندہی کو جان کر ہمیں اس جگہ سے یہ زیور ملا ہے۔ اب اس زیور کو فروخت کر کے کوٹھی کا قرضہ ادا کرنا ہے۔ بینک سے حویلی کو چھڑوانا ہے۔" اتنا کہہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور زیور زیدی صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔

زیدی صاحب نے زیور ہاتھ میں لے کر دیکھا اور کہا: "کافی قیمتی زیور ہے۔ لاکھوں میں اس کی قیمت جائے گی۔ چاندنی چوک پر میرے ایک پہچان کے سنار ہیں۔ محمد یٰسین صاحب حاجی اور حافظ ہیں۔ صحیح قیمت وہی بتا سکتے ہیں اور صحیح جگہ وہی فروخت کروا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا: "اس کام کو کروا دیجئے۔ اس لڑکے کو پریشانیوں سے نجات دلوا دیجئے۔"

زیدی صاحب نے کہا: "ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ پھر زیور مجھے دے کر کہا۔ آپ اسے اپنی جیب میں رکھ لیں۔" میں نے زیور کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر انھوں نے کہا: "رکئے میں آپ کو ایک بیگ دیتا ہوں زیور اس میں رکھ لیں۔" اپنے کیبن میں ٹنگے ہوئے ایک لیدر کے بیگ کو انھوں نے اتارا۔ اس میں کی چیزیں ٹیبل کی دراز میں رکھ لیں اور وہ بیگ مجھے دے دیا۔ میں نے زیور اس بیگ میں رکھ لیا اور ہم کیبن سے نکل کر باہر آ گئے۔ نیچے بڑے روڈ پر آ کر ہم نے آٹو رکشہ لیا اور چاندنی چوک کی سمت روانہ ہو گئے۔

دکان کے پاس پہنچ کر انھوں نے رکشہ والے سے رکنے کو کہا۔ ہم اندر دکان میں داخل ہوئے۔ حافظ صاحب نے زیدی صاحب کو دیکھا تو انہیں سلام کیا۔ مسکراتے ہوئے آنے کا سبب دریافت کیا۔ زیدی صاحب نے کہا: "بڑے اہم کام کے سلسلے میں آیا ہوں معاملہ بہت نازک ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کے ہی بس کا کام ہے۔"

حافظ صاحب نے کہا: "ٹھیک ہے حضور بتایئے کیا کام ہے۔ ہم نے بڑے

بڑے لوگوں کے بڑے بڑے مسائل سلجھا دیئے ہیں اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''جی ہاں میں جانتا ہوں اسی لئے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔''

حافظ صاحب نے کہا: ''آیئے اندر کیبن میں آ جایئے۔'' ہم لوگ اندر کیبن میں داخل ہو گئے۔ ٹیبل کے سامنے رکھے ہوئے اسٹولوں پر بیٹھ گئے۔ زیدی صاحب نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے بیگ میں سے ہار نکالا اور حافظ صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔

حافظ صاحب نے ہار دیکھا تو کہا: ''شاہی گھرانے کی چیز ہے۔ ایسی چیزوں کے خریدار شہر میں دو چار ہی ہوں گے۔ کوئی عام آدمی تو اسے فروخت بھی نہیں کر سکتا۔ آپ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں پہچانتا ہوں میں آپ کی یہ چیز صحیح قیمت میں فروخت کرواؤں گا لیکن اپنا کمیشن بھی لوں گا۔''

زیدی صاحب نے کہا: ''بیشک آپ محنت کریں گے تو اس کی اجرت تو لیں گے ہی بس میری یہی گزارش ہے کہ یہ پارٹی انتہائی مجبوری کی حالت میں یہ خاندانی ہار فروخت کر رہی ہے اگر انہیں وقت پر پیسے نہ ملے تو گھر کی عزت سڑک پر آ جائے گی اس لئے آپ سے گذارش ہے کہ اس کی بالکل صحیح قیمت دلوادیں آپ اپنا واجبی کمیشن بھی لے لیں کیا ہم جان سکتے ہیں آپ کے اندازے کے مطابق یہ ہار کتنی مالیت کا ہوگا۔''

حافظ صاحب نے عدسے کی مدد سے ہیروں کو دیکھا۔ سونے کو کسوٹی پر رگڑا ہیروں کو گنا اور کیلکولیٹر سے حساب نکال کر بتایا کہ ان کے اندازے سے یہ کم سے کم 80 لاکھ روپے کا ہار ہے۔

تفضّل نے یہ رقم سنی تو اسے از حد اطمینان ہوا۔ کوٹھی پر کم سے کم 60 لاکھ روپے قرض لئے گئے تھے۔ سود ملا کر وہ 70 لاکھ کے قریب ہو گیا ہوگا۔ اسے لگا کہ اس ایک ہار سے ہی کوٹھی کا قرض ادا ہو جائے گا اور ایک بہت بڑی مصیبت اس کے سر سے ٹل جائے

گی۔زیدی صاحب نے میری طرف دیکھا میں نے تفضّل کی طرف دیکھا اس نے کہا:
''اصل بیوپاری سے معلوم کرلیں کتنا ملے گا اور حضرت کا کمیشن ادا کرنے کے بعد ہمارے ہاتھ میں کتنی رقم آئے گی۔''

حافظ صاحب نے کہا: ''دیکھئے میں اس ہار کو صحیح قیمت میں فروخت کرواؤں گا اور کمیشن 2 فیصد لوں گا یعنی ایک لاکھ پر دو ہزار۔یعنی 80 لاکھ کا ہار ہوا تو میرا کمیشن ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپئے ہو جائے گا۔''

کمیشن میں اتنی رقم جاتی دیکھ کر میں نے تفضّل کی طرف دیکھا اس نے حافظ صاحب سے کہا: ''دیکھئے کچھ مناسب لے لیجئے۔''

حافظ صاحب نے کہا: ''میں اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت دلوانے کی کوشش کروں گا اور آپ لوگ اپنے طور پر تو اس ہار کو فروخت بھی نہیں کر پائیں گے۔''

زیدی صاحب نے کہا: ''حافظ صاحب مصیبت زدہ لوگ ہیں اچھی قیمت دلوا دیجئے اور کمیشن کے طور پر آپ ایک لاکھ روپئے لے لیں۔یہ مناسب رہے گا۔''

حافظ صاحب نے کہا: ''چلئے ٹھیک ہے آپ کی پیشکش مجھے منظور ہے۔آیئے چلتے ہیں۔''

تفضّل نے کہا: ''میں اپنی والدہ کو فون پر بتا دیتا ہوں۔''

میں نے کہا: ''ہاں بات کرلو۔''

تفضّل نے الگ جا کر اپنی والدہ سے فون پر بات کی انھوں نے رضامندی ظاہر کردی۔ہم سب لوگ حافظ صاحب کی کار میں بیٹھ کر بیوپاری کی دکان کی طرف روانہ ہوئے۔آٹو رکشہ والا وہاں موجود تھا زیدی صاحب نے آٹو رکشہ والے کا حساب صاف کردیا اور اسے چلے جانے کو کہہ دیا۔حافظ صاحب کی کار میں بیٹھ کر ہم نئی دلی کے ایک پاش ایریا میں آئے۔بہت بڑی جیولری کی دکان تھی۔اس میں داخل ہوئے۔تین

منزلہ دکان تھی۔ ہم گراؤنڈ فلور کے ایک کونے میں بنے کیبن میں داخل ہوئے۔ وہاں دو لوگ سفید اجلے کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب کو دیکھ کر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان سے مصافحہ کیا حال چال دریافت کیا اور بیٹھنے کو کہا۔ یہ ایک ایئر کنڈیشن کیبن تھا۔ جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: ”کہیے حافظ صاحب آپ نے کیسے زحمت کی؟“

حافظ صاحب نے کہا: ”ایک خاندانی چیز آ گئی ہے وہی لے کر آپ کے پاس آیا ہوں دیکھیے یہ کیا چیز ہے۔“ اتنا کہہ کر حافظ صاحب نے مجھے اشارہ کیا میں نے بیگ میں سے جڑاؤ ہار نکالا اور ٹیبل پر سامنے رکھ دیا۔ اس نے زیور کو اٹھا لیا مختلف زاویوں سے دیکھتا رہا۔ پھر کہا: ”چیز اچھی ہے، خالص ہے۔“

حافظ صاحب نے کہا: ”دیکھ پرکھ کر لایا ہوں آپ بھی ٹیسٹ کروا لیں۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ پھر اس شخص نے انٹرکوم پر کسی کو اندر بلایا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے مالک کے کہنے پر وہ ہار اپنے ہاتھ میں لے لیا وہیں کیبن میں کچھ آلات رکھے ہوئے تھے ان کی مدد سے انہیں جانچا پرکھا۔ پھر مطمئن ہو کر اس نے مارواڑی زبان میں اطمینان کا اظہار کیا اور چلا گیا۔

حافظ صاحب نے کہا: ”اسے بیچنا ہے۔“

بیوپاری نے کیلکولیٹر پر حساب لگانا شروع کیا اور کہا: ”اس کے 75 لاکھ روپے بنتے ہیں۔“

حافظ صاحب نے کہا: ”دیکھیے خاندانی چیز ہے مجبوری میں بیچنے کے لئے نکالی گئی ہے۔ مناسب قیمت دے دیں۔ یہ سمجھ لیں کے میرے گھر کی چیز ہے۔“

بیوپاری نے کہا: ”حافظ صاحب آپ بھی اس کے جانکار ہیں ایسی چیز جلدی بکتی کہاں ہیں، برسوں سنبھال کر رکھنا پڑتا ہے۔ اس کا ماڈل اولڈ ہو چکا ہے۔ اس پر

نئے سرے سے محنت کرنی پڑے گی۔ پھر آپ تو سب کچھ جانتے ہی ہیں۔''

''پھر بھی کچھ نکال دیجئے مصیبت زدہ لوگ ہیں۔ دعا دیں گے۔''

اس شخص نے اپنی بغل میں بیٹھے ہوئے شخص سے جو اس کا بڑا بھائی لگتا تھا ان کی اپنی زبان میں کچھ کہا آخر 80 لاکھ قیمت دینا طے ہوگیا۔

بیوپاری نے پوچھا: ''رقم کس طرح لیں گے۔''

میں نے کہا: ''60 لاکھ کا چیک دے دیں 20 لاکھ روپے کیش دے دیں۔''

''چیک کس کے نام سے بنائیں؟''

میں نے تفضّل سے پوچھا: ''بینک سے قرض کس کے نام سے لیا گیا ہے۔''

اس نے کہا: ''قرض ابو کے نام سے لیا گیا ہے۔''

میں نے کہا: ''قرض کس بینک سے لیا گیا ہے۔''

اس نے کہا: ''اسٹیٹ بینک آف انڈیا سے لیا گیا ہے۔''

میں نے کہا کہ: ''اسٹیٹ بینک آف انڈیا کے نام سے چیک بنادیں۔''

اسی وقت چیک بن کر مل گیا۔ کیش کی رقم بھی مل گئی۔ بیوپاری نے اس کی پکّی رسید بنائی اور اس پر زیدی صاحب، حافظ صاحب، میرے اور تفضّل کے دستخط لے لئے اور ہم لوگ وہاں سے نکلے۔ حافظ صاحب کی دکان میں پہنچ کر ہم نے ایک لاکھ روپئے انہیں دے دیئے اور حافظ صاحب سے درخواست کی کہ زیدی صاحب کو ان کے گھر اور ہمیں ہمارے گھر اپنی کار میں پہنچادیں۔ حافظ صاحب نے ڈرائیور کو ہدایت دی اور ہم کار میں بیٹھ گئے۔ زیدی صاحب کو ان کے گھر چھوڑ کر ہم کوٹھی میں آئے میں نے تفضّل سے کہا کہ وہ بینک کا نوٹس گھر میں ہوگا تو لے آئے ابھی بینک میں رقم جمع کر دیتے ہیں۔ مجھے میرے کمرے میں چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں گیا اور تھوڑی دیر بعد میرے کمرے میں آیا تو اس کے ہاتھ میں کئی خاکی رنگ کے لفافے تھے۔ میں نے ان

لفافوں میں سے لیٹر نکال کر پڑھے اور آخری تاریخ کا نوٹس دیکھ کر کہا: ''کہ 65 لاکھ روپئے بینک میں جمع کرنے ہیں۔ چلو ابھی جمع کر کے آجاتے ہیں اپنی والدہ کو بتادو۔''

اس نے جا کر اپنی والدہ کو بتادیا انھوں نے کہا کہ وہ بھی ساتھ چلیں گی۔ میں نے کہا: ''میں بینک پہنچتا ہوں تم اپنی والدہ کو لے کر وہاں آجاؤ۔''

میں نے باہر نکل کر رکشہ کیا اور SBI کی مقامی برانچ میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر میں دونوں ماں بیٹے بھی آگئے۔ ہم نے بینک کے منیجر کے کمرے میں جا کر نوٹس دکھائے اور رقم ادا کرنے کی بات کہی اس نے پورا حساب نکال کر ہمیں دیا ہم نے کیشئر کے پاس چیک اور Cash جمع کر دیئے کلیرنس کے کاغذات اس سے لے لئے پراپرٹی کے پورے کاغذات بھی ہمیں مل گئے ساری چیزیں لے کر دونوں ماں بیٹے باہر کرسی پر بیٹھ گئے۔ تب تفضّل کے امی نے کہا کہ اس بات کا علم آج نہیں تو کل اس کے ابو کو ہو جائے گا اور جس دن انہیں یہ بات معلوم ہوگی گھر میں طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس لئے میرے خیال سے جو باقی بچے ہوئے زیورات ہیں انہیں کسی محفوظ جگہ رکھ دیا جائے۔ یہ طوفان گذر جائے تو پھر ہم انہیں اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں۔

میں نے کہا: ''آپا یہ بات آپ نے اچھی کہی اور پھر سے میرا خیال ڈاکٹر خوشحال زیدی صاحب کی طرف جارہا ہے۔ وہ ایسے شخص ہیں کہ ہمارے کام میں شریک ہیں اور آپ کے گھر کے کسی آدمی کو یہ بات معلوم بھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں وہی ایک محفوظ جگہ ہے جہاں ان بچے ہوئے زیورات کو رکھا جا سکتا ہے یا آپ کے رشتہ داروں میں کوئی بھروسے کے لائق ہو تو ان کے گھر میں رکھوادیا جائے۔''

تفضّل کی والدہ نے کہا: ''بھائی صاحب آپ نے بڑی محنت سے یہ سب حاصل کیا ہے اب آپ ہی اسے کہیں حفاظت سے رکھوادیں۔''

میں نے کہا: ''ایک کام کریں چھوٹے چھوٹے زیورات کو گھر میں ہی رکھ لیں جو

بہت قیمتی زیورات ہیں انہیں کسی اسٹیل کے باکس میں اچھی طرح بند کر کے زیدی صاحب کے گھر میں رکھوادیں۔ حالات پرسکون ہو جائیں تو وہاں سے باکس اٹھالیں گے۔"

اس بات سے سب نے اتفاق کیا۔ طئے یہ پایا کہ میں ایک اچھی سی اسٹیل کی پیٹی خریدلوں اوراس میں قیمتی زیورات بند کر کے زیدی صاحب کے گھر میں رکھوادوں۔

وہیں سے میں نے ڈاکٹر زیدی صاحب کو فون لگایا۔ ان باتوں کی تفصیل بیان کردی۔ وہ تو کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے کہنے لگے ارے بھائی تمہاری وجہ سے میں کسی مصیبت میں نہ پڑ جاؤں۔ میں نے کسی طرح انہیں راضی کرلیا۔

باہر کے باہر باکس خریدا گیا۔ مضبوط تالے خریدے گئے۔ پاس کے ایک گارڈن میں میں باکس لے کر بیٹھا رہا۔ تفضّل ایک تھیلی میں وہ زیورات لے کرآ گیا۔ میں نے اسے باکس میں رکھ دیا اوراس میں تالے لگادیئے۔ آٹو رکشہ سے لے جاکر زیدی صاحب کے سپرد کردیا۔ انھوں نے اسے لے لیا۔ چابیاں میں نے تفضّل کو دے دیں۔ جلدی سے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ تفضّل کوٹھی چلا گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اپنا وقت گذارا۔ اس وقت مجھے لگا کہ اب میرا کام ختم ہو چکا ہے آج یا کل میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ یہی سوچ کر میں شہر میں گھومتا رہا۔ اچانک مجھے مہمان خانے کے بڑے پلنگ کا خیال آیا اور کچھ سوچ کر ایک دکان سے میں نے تین چھوٹے بڑے اسکروڈرائیور خرید لئے۔

شام کو زیدی صاحب سے ملاقات کی۔ رات کا کھانا انہیں کے گھر پر کھایا۔ وہاں سے نکل کر کوٹھی پہنچا۔ اندراپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے دروازہ اچھی طرح اندر سے بند کرلیا۔ میرے کمرے میں جو بڑا پلنگ تھا نیچے فرش پر بیٹھ کر اس کے سرہانے کی طرف دیکھا۔ سرہانے کی طرف نچلی جانب ایک تین انچ چوڑی پٹی پلنگ کے ایک

پائے سے دوسرے پائے تک لگی ہوئی تھی اور دونوں کناروں پر اسکرو سے کسی ہوئی تھی۔ میں نے جیب سے اسکرو ڈرائیور نکالا اور انتہائی احتیاط سے زمین پر لیٹ کر اسکرو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی سی محنت سے لکڑی کی پٹی نکل کر میرے ہاتھ میں آ گئی۔ اندر ایک خانے میں لال رنگ کی ایک مخمل کی خوبصورت سی تھیلی رکھی ہوئی تھی میں نے اس تھیلی کو نکال لیا۔ باہر نکل کر آیا۔ تھیلی کا منہ مضبوط ریشمی ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے کھولا اور آہستہ آہستہ اسے اپنی ہتھیلی کی طرف جھکایا۔ چند ہیرے تھیلی سے نکل کر میری ہتھیلی پر آ گئے وہ بلب کی روشنی میں عجیب عجیب رنگوں میں چمک رہے تھے، میں نے وہ ہیرے پھر سے تھیلی میں رکھ دیئے اور ٹٹول کر ہیروں کو دیکھا۔ دس پندرہ ہیرے رہے ہوں گے۔ کچھ دیر تو میں سکتے کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر میں نے ہیروں کی تھیلی اپنے سوٹ کیس میں رکھ لی، سوٹ کیس کو تالا لگا دیا اور پلنگ کے نیچے جا کر لکڑی کی پٹی کو پھر سے اسی طرح کس دیا۔ اسکرو ڈرائیور کو ایک کونے میں ڈال دیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔

سویرے 10 بجے تفضّل میرے کمرے میں آیا۔ میں نے اس سے کہا: ”بیٹا، میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ میں رات کی ٹرین سے ناگپور چلا جاتا ہوں۔“

اس نے کہا: ”ٹھیک ہے انکل جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“

میں نے کہا: ”میں ریلوے کے ایجنٹ سے مل کر ٹکٹ بنوا لیتا ہوں رات 9½ کی ٹرین ہے اس سے چلا جاؤں گا اور گھر میں سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟“

”جی سب نارمل ہے۔ آپ نے بڑی زحمت کی۔ میرے لئے اتنی تکلیف اٹھائی۔ میرے الجھے کام سلجھا دیئے۔ شام کو آپ سے ملتا ہوں۔ امی نے کہا ہے شام کو کھانا گھر پر ہی کھائیں کہیں سے کھا کر نہ آئیں۔“

”بہتر ہے!“ میں نے کہا۔ تفضّل وہاں سے چلا گیا۔ میں نے اپنا سارا سامان

سوٹ کیس میں رکھ لیا۔ نکلنا ہی چاہتا تھا کہ تفضّل کے والد میرے کمرے میں آ گئے اور مجھ سے بڑے ہی کڑوے لہجے میں کہا: ''اور کب تک اس کوٹھی میں آپ کا پڑاؤ ہے؟''

میں نے کہا: ''آج رات روانہ ہو رہا ہوں۔''

انھوں نے کہا: ''چلو اچھا ہے۔ دھیرے دھیرے یہاں کی ساری مصیبتیں دور ہوتی جا رہی ہیں۔''

''اللہ جلد از جلد آپ کو تمام مصیبتوں سے دور کر دے۔'' میں نے کہا اور کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں تفضّل کا ماموں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہیں تفضّل بھی کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ان دونوں پر سرسری سی نظر ڈالی اور کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

کوٹھی کے سامنے بڑی سڑک تھی اور سڑک کی دوسری جانب لڑکیوں کا ہائی اسکول تھا۔ اسکول کے سامنے ایک بڑی بی بچوں کے کھانے پینے کی چیزیں فروخت کرتی تھیں۔ میں جب بھی کوٹھی سے نکل کر جاتا تھا تو وہ بغور مجھے دیکھتی تھیں اور ایک عجیب بات یہ تھی کہ میں بھی ٹھٹک کر بلکہ رک کر انہیں دیر تک دیکھتا تھا کیونکہ اس خاتون کی شکل حد درجہ میری والدہ کی شکل سے ملتی جلتی تھی۔ ویسے ہی سفید الجھے ہوئے بال۔ دبلا پتلا چہرہ، ویسا ہی لباس۔ اس وقت سب بچیاں جماعتوں میں تھیں۔ بڑی بی اکیلی بیٹھی ہوئی تھیں میں گیا اور ان کے پاس جا کر رک گیا۔ سلام کیا۔ میں نے کہا: ''امّاں کیسی ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں بیٹا اچھی ہوں تم سناؤ۔''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ ناگپور سے آیا تھا آج رات چلا جاؤں گا۔''

''اچھا، خدا تمہارا بھلا کرے۔ سفر آسان کرے۔ کیا نام ہے تمہارا۔''

میں نے کہا: ''میرا نام وکیل نجیب ہے۔''

میرا نام سن کر وہ از حد حیران ہوئیں اور کہا: ''حیرت ہے میرا بھی ایک بیٹا تھا۔ بچپن میں گم ہو گیا وکیل احمد اس کا نام تھا۔ اس کے ابو کا نام نجیب احمد تھا۔''

یہ بات سن کر ان سے کہیں زیادہ میں حیران ہوا۔ میں نے کہا: ''کہیں آپ کا نام عائشہ بی تو نہیں ہے۔''

''ارے تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا۔ ہاں میرا نام عائشہ بی ہی ہے۔'' انھوں نے حیرت سے کہا۔

میں نے کہا: ''دراصل میری والدہ کا نام بھی عائشہ بی تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے میں یہاں سے سینکڑوں کلومیٹر دور رہتا ہوں۔ آپ کے گھر کے لوگوں کے ناموں میں اور میرے گھر کے لوگوں کے ناموں میں کس قدر یکسانیت ہے۔ حیرت کی بات ہے۔''

بڑی بی نے کہا: ''بیٹا، حیرت کی بات کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ اوپر والا ہے نا۔ سب اسی کا رچایا ہوا کھیل ہے۔ اب یہ کوٹھی والوں کو دیکھو پندرہ بیس سال پہلے کیسی شان وشوکت تھی اور اب پوری کوٹھی کھنڈر بن گئی ہے۔ سب اوپر والے کا کھیل ہے بیٹا۔ تم ان کے یہاں کیسے آ گئے۔''

میں نے کہا: ''بڑے مرزا صاحب سے میرے تعلقات تھے۔ مجھے ان کے انتقال کی خبر ملی تو میں یہاں چلا آیا۔ آج رات یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

بڑی بی نے کہا: ''بیٹا ایسا مت کہو، آنا جانا سب اُس کے ہاتھ میں ہے کون کب آئے گا اور کب جائے گا یہ کہنا مشکل ہے۔ اللہ سب کو خیر و عافیت سے اٹھا لے اور سب سے پہلے مجھے اپنے پاس بلا لے۔''

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے توبہ توبہ کے انداز میں منہ پر طمانچے لگائے اور کہا: ''مجھ بوڑھی کو لگتا

ہی کیا ہے۔ سب مجھے مل جاتا ہے۔ میری ضرورت سے زیادہ مل جاتا ہے۔ خدا تمھیں سلامت رکھے۔" انھوں نے میرا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کر دیا۔ میں نے نوٹ جیب میں رکھ لیا اور ان سے پوچھا: "اماں، یہ بتائیے کہ یہ دونوں سالے بہنوئی صبح گھر سے نکلتے ہیں تو پھر رات کو ہی لوٹتے ہیں۔ یہ دونوں دن بھر کہاں رہتے ہیں؟"

بڑی بی نے کہا: "بیٹا اس بات کا علم کسی کو نہیں ہے لیکن گھر سے دونوں ہی ساتھ نکلتے ہیں وہاں چوک پر شرفو آٹو رکشہ والا ہے، اس کے رکشے میں بیٹھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ بس شرفو ہی ان کا پتہ ٹھکانہ بتا سکتا ہے۔"

میں نے بڑی بی کا شکریہ ادا کیا اور چوک پر آیا۔ تین چار آٹو رکشے کھڑے ہوئے تھے میں نے ان میں سے ایک سے پوچھا: "شرفو کہاں ہے؟"

ایک آٹو والے نے کہا: "وہ سواری لے کر گیا ہے۔ ابھی واپس آجائے گا۔ کہاں جانا ہے؟"

میں نے کہا: "نہیں، اسی سے کام ہے۔"

میں وہیں ایک چائے کی دکان میں بینچ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ آ گیا۔ دوسرے آٹو والے نے اُسے بتایا کہ میں اُسے پوچھ رہا تھا۔ وہ ہوٹل میں میرے پاس آیا سلام کیا اور مجھ سے کہا: "آپ مجھے پوچھ رہے تھے؟"

میں نے کہا: "ہاں مجھے کوٹھی والے مرزا صاحب سے ملنا ہے۔ میں دوسرے شہر سے خاص ان سے ملنے آیا ہوں۔ وہ کہاں ملیں گے۔"

اس نے کہا: "چلیے میں ان کے پاس لے کر چلتا ہوں۔ 50 روپے ہوں گے۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے چلو۔"

میں اس کے آٹو رکشہ میں بیٹھ گیا۔ پون گھنٹے بعد وہ ایک گنجان محلّے میں آیا۔ سڑک کی ایک طرف آٹو رکشہ کھڑا کر دیا اور دور سے ہی مجھے بتایا کہ دیکھو وہ جو بیئر بار

نظر آرہا ہے بڑے مرزا صاحب وہیں ملیں گے۔ اندر کاؤنٹر کے پیچھے کمرہ ہے وہیں بیٹھتے ہیں۔"

میں نے اس کا پیسہ اسے دے دیا اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے بیئر بار کے قریب آیا۔ یہ ایک اچھا بڑا سا ہال تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر ٹیبل تھے اور ان کے گرد کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے اندر داخل ہونے میں ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ میں ہمت کر کے اندر داخل ہوا اور کارنر میں لگے ایک ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ صبح کا وقت تھا اندر کچھ زیادہ لوگ نہیں تھے۔ بیرا فوراً میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا: "میرے چند دوست آنے والے ہیں تب تک ایک کوکا کولا لے آؤ۔"

وہ گیا اور فریج میں سے ایک کوکا کولا لے کر آ گیا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ کافی ادب سے پیش آ رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ کوکا کولا پیتا رہا۔ پھر میں نے اس بیرے کو اشارے سے اپنے قریب بلایا اور اس سے کہا: "یہاں سے تمہیں فرصت کب ملتی ہے؟"

صاحب دن میں تو فرصت ہی رہتی ہے۔ شام کے بعد پھر رات تک فرصت نہیں ملتی۔"

میں نے کہا: "تم مجھے دس منٹ کا وقت دے سکتے ہو تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

اس نے کہا: "ابھی؟"

میں نے کہا: "ہاں ابھی۔" پھر میں نے سو کا نوٹ نکالا، اس کے ہاتھ میں رکھ دیا اور اس سے کہا: "کوکا کولا کا بل ادا کر دو اور باقی پیسے تم رکھ لو۔ میں باہر ہوٹل میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

اس نے نوٹ لے لیا اور مجھ سے کہا: "میں مینیجر سے بول کر آ رہا ہوں۔" میں وہاں سے اٹھ کر قریب میں ہی ایک ریسٹورینٹ تھا وہاں بالکل دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔ پانچ منٹ میں ہی وہ لڑکا وہاں آ گیا۔ میں نے ہوٹل کے بیرے کو چائے کا آرڈر دیا اور اس لڑکے سے کہا: "تمہارے بیئر بار میں وہ جوا کاؤنٹ وغیرہ لکھتے ہیں مرزا

صاحب میں ان کا رشتے دار ہوں۔ ان کے بارے میں مجھے کچھ معلومات چاہئے۔''

اس نے کہا: ''صاحب وہ تو بگڑے نواب ہیں لاکھوں روپے جوئے شراب اور سٹے میں برباد کر چکے ہیں اور اس بربادی میں ان کا سالا عظیم خاں پیش پیش ہے۔''

میں نے کہا: ''کیسے؟''

اس نے کہا: ''وہ مرزا صاحب کو ان کاموں میں لگا دیتا تھا اور دکان میں ادھر کا مال ادھر کرتا رہتا تھا۔ اسی میں مرزا صاحب قرض میں ڈوب گئے۔ دکان بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ سالے نے جمنا پار ایک مکان خرید لیا ہے۔ وہاں دوسری عورت ہے۔ وہیں ایک کمرے میں کپڑوں کی دکان لگا کر اپنے سالوں کو دے دی ہے۔ وہ وہاں موج مار رہا ہے۔ یہاں کا سارا مال وہاں پہنچ گیا ہے۔ اب وہ انہیں یہاں بیئر بار میں بیٹھا دیتا ہے ان کے کھانے پینے کے پیسے دے دیتا ہے۔ خود جمنا پار چلا جاتا ہے۔ رات کو آتا ہے اور مرزا صاحب کو ساتھ میں لے کر کوٹھی چلا جاتا ہے۔ بس یہی چل رہا ہے۔ مرزا صاحب کی حالت ایسی ہے کہ اگر انہیں شراب نہ ملے تو ست پڑے رہتے ہیں۔ بات کرنا بھی نہیں سدھرتا۔ اچھے دنوں میں ہمارے مالک سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات رہے ہیں اس لئے ان کے لئے ایک الگ کمرہ دے دیا ہے لکھنے پڑھنے کا کچھ کام بھی کرتے ہیں اور دن بھر یہیں پڑے رہتے ہیں۔''

میں نے پوچھا: ''جمنا پار ان کے سالے کا مکان کہاں پر ہے؟''

''بڑی سڑک پر بجلی کا آفس ہے بس اس کے بغل میں کپڑے کی دوکان ہے اور اسی میں پیچھے مکان ہے۔ وہی اُس کا ٹھکانہ ہے۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ سو روپے اسے اور دیئے اور اس سے کہا کہ مرزا صاحب کو یہ سب مت بتانا۔''

''نہیں صاحب، مرزا صاحب تو کسی سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے، ہم لوگ

ان سے دور دور رہتے ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں باہر آیا۔ ایک دو لوگوں سے پوچھ کر بس اسٹینڈ پر آیا اور جمنا پار کی بس میں سوار ہو گیا۔

آدھے گھنٹے بعد میں جمنا پار میں تھا۔ لوگوں سے پوچھتا ہوا بجلی کے آفس کے پاس پہنچ گیا۔ اسی لائن میں کپڑوں کی ایک دکان تھی۔ "فرینڈس کلاتھ اسٹورس" اندر دو لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دو گاہک بھی تھے، لیکن عظیم خاں وہاں نہیں تھا۔ میں دوسرے کنارے کھڑے رہ کر کافی دیر تک کپڑے کی دکان کی نگرانی کرتا رہا۔ مکان کافی بڑا تھا اور اچھا بنا ہوا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مرزا صاحب کو برباد کر کے خان صاحب یہاں آباد ہو گئے ہیں اور مزید دولت کی تمنا میں مرزا صاحب کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں۔ دوپہر میں ڈھائی بجے میں نے دیکھا کہ عظیم خاں ایک خوبصورت، صحت مند عورت کے ساتھ بغل کے دروازے سے نکل کر باہر آیا۔ ایک نظر اس نے دکان میں ڈالی پھر دونوں آگے بڑھے، ایک جگہ انہیں آٹو رکشہ مل گیا اس میں بیٹھ کر دونوں چلے گئے۔ میں بھی وہاں سے نکلا اور ترقی اردو بیورو کے دفتر آر کے پورم پہنچ گیا۔ وہاں دفتر کے لوگوں سے ملاقات کرنی تھی۔ میں وہاں بیٹھا ہوا تھا تین بجے کا وقت تھا تبھی میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ تفضل کا فون تھا۔ میں نے فون آن کیا اور کہا: "ہاں بولو کیا بات ہے؟"

اُس کی گھبرائی ہوئی لرزتی اور کانپتی ہوئی آواز آئی: "انکل آپ جہاں بھی ہیں وہاں سے فوراً کوٹھی میں آجائیں۔ میرے والد کو بینک کے کسی بابو نے بتا دیا ہے کہ ان کا پورا قرض بینک میں ادا کر دیا گیا ہے۔ جیسے ہی یہ بات انہیں معلوم ہوئی وہ کوٹھی میں آئے مجھے اور میری والدہ کو بے تحاشہ مار رہے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ یہ رقم ان کے پاس کہاں سے آئی۔ ہمارے سارے رشتہ دار یہاں جمع ہیں۔"

میں بیورو کے دفتر سے نکلا۔ آٹو رکشہ سے کوٹھی پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ کوٹھی کے

مین گیٹ پر محلّے کے درجنوں لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ میں کسی طرح اندر داخل ہوا۔ اندر پورا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ تفضّل کے والد ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے منہ سے اناپ شناپ جملے نکل رہے تھے۔ لوگ انھیں روکنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جیسے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے انہوں نے گندی گالی دی اور مجھ پر حملہ کرنے کے ارادے سے آگے بڑھے۔ میں نے انہیں روک لیا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھے۔ ان کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ میرے ساتھ ہی اور لوگوں نے بھی انہیں آگے بڑھنے سے روکا۔ انھوں نے مجھ سے کہا: ”تو کون ہے؟ تو ہمارے گھر کے معاملات میں کیوں پڑا ہوا ہے۔ کہاں سے آیا ہے تو؟ میری دولت کو لوٹنے برباد کرنے آیا ہے۔ میں تجھے مار ڈالوں گا۔“

میں نے کہا: ”آپ کے والد سے میرے تعلقات تھے۔ آپ کا بیٹا میرے پاس آیا تھا۔ تب میں یہاں آیا۔ میں آج چلا جاؤں گا۔ مجھے آپ کے گھریلو معاملات میں پڑنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

اتنا کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ تفضّل دوڑ کر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا: ”انکل آپ یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آپ نے ہماری مدد کی ہے۔ میں اپنی والدہ کو یوں ظلم سہتے نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کہیں نہیں جائیں گے۔“

تفضّل کے منہ سے یہ بات سن کر اس کے والد طیش میں آ گئے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ ایک زوردار طمانچہ انھوں نے تفضّل کے منہ پر مارا۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ وہ اس کی طرف آگے بڑھنے لگے۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں روک لیا اور کہا: ”نہیں آپ اسے نہیں مار سکتے۔“ اتنا کہہ کر میں نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ انھوں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن میرے ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے وہ اپنے آپ کو آزاد نہ کرا پائے۔ دوسرے لوگوں نے بھی انہیں آگے بڑھنے سے روکا۔ تبھی

انھوں نے کسی طرح اپنے آپ کو چھڑا لیا اور دوڑتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔اب وہاں سے جو آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی۔تلوار کو ہوا میں لہراتے ہوئے وہ خوفناک ارادے سے میری طرف بڑھے اور انھوں نے چلاّ کر کہا: ''میرے بیچ میں کوئی بھی آئے گا تو میں اسے کاٹ کر رکھ دوں گا۔'' اتنا کہہ کر انھوں نے ایک بار پھر ہوا میں تلوار لہرائی۔تبھی ایک عجیب بات ہوئی۔نہ جانے کہاں سے تفضّل کی والدہ تیزی سے دوڑتی ہوئی آئیں۔ان کا چہرہ لہولہان تھا۔چہرے پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے۔ان کے ہاتھ میں ایک مضبوط ڈنڈا تھا۔وہ ڈنڈا لے کر تیزی سے آگے بڑھیں اور اس ڈنڈے کا بھرپور ہاتھ انھوں نے تفضّل کے ابو کے سر پر مارا۔اُن کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔تلوار ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔وہ اپنی جگہ پر لہرائے۔ایک دو چکر کھائے اور فرش پر ڈھیر ہو گئے۔خون ان کے سر سے بہہ رہا تھا۔تفضّل کی والدہ نے چلا کر کہا: ''اسی آدمی نے اس دولت کی خاطر اپنے باپ کا گلا گھونٹ کر مارا ہے۔میں اب تک چپ رہی۔اب چپ نہیں رہوں گی۔اس ایک آدمی نے سارے لوگوں کی زندگی جہنم بنادی ہے۔میں نے اپنی آنکھوں سے ابو جان کو تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھا ہے۔میں سارے لوگوں کو اس کے عذاب سے چھٹکارہ دلاؤں گی اس میں چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔'' پھر وہ تفضّل کی طرف مڑیں اور کہا: ''چل بیٹا پولیس تھانے چل۔میں سب کچھ صحیح صحیح بتادوں گی۔''

اتنا کہہ کر انھوں نے تفضّل کا ہاتھ تھاما اور اُسے کھینچتی ہوئی کوٹھی سے باہر نکل گئیں۔اس معاملے کی خبر کسی نے فون پر پولیس کو بھی دے دی تھی۔پانچ منٹ میں ہی پولیس کی گاڑی وہاں پہنچ گئی۔تحقیقات شروع ہو گئی۔ایمبولینس بلوا کر تفضّل کے ابو کو اسپتال بھجوادیا گیا۔لوگوں سے پوچھ پوچھ کر انسپکٹر بیانات لکھنے لگا۔

پولیس انسپکٹر نے میرا بیان لکھ لیا تو میں اس سے اجازت لے کر پولیس تھانے

پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا وہاں تفضّل اور اس کی والدہ بیٹھے ہوئے تھے۔ تفضّل کی والدہ کے چہرے پر جو زخم آئے تھے اُن پر پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ضابطے کی کارروائی ہو جانے کے بعد انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ہم لوگ آٹو رکشہ میں بیٹھ کر کوٹھی آ گئے۔ پولیس والے اب تک وہاں موجود تھے۔ وہیں انھوں نے تفضّل اور اس کی والدہ کے بیان بھی قلمبند کر لیے۔ تلوار اور ڈنڈا اپنے قبضے میں لے لیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ تفضّل کے والد کے سر پر کافی گہری چوٹ لگی تھی۔ وہ سٹی اسپتال میں بھرتی کر لئے گئے تھے۔

گھر میں سارے رشتے دار جمع تھے۔ ایک عجیب طرح کی ماتمی فضا پوری کوٹھی پر بسیرا کئے ہوئے تھی۔ میں تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہا۔ تفضّل اور اس کے امی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا اور ان حالات پر غور کرنے لگا۔

رات کے 9 بجے تھے پھر سے پولیس کی گاڑی کوٹھی کے سامنے آ کر رکی۔ پولیس انسپکٹر اور چار سپاہی گاڑی سے اترے۔ ان کے ساتھ تفضّل کے ابّو بھی تھے۔ وہ سارے لوگ کوٹھی میں داخل ہوئے اور صوفوں پر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر نے تفضّل کے امی کو بلوایا۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئیں اور ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ تفضّل بھی آ کر ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ انسپکٹر نے تفضّل کے امی کی طرف دیکھا اور کہا: ''میڈم تھانے میں آپ نے بیان لکھوایا ہے کہ آپ کے شوہر نے اپنے والد کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ یہ حادثہ کب ہوا اور کون سے کمرے میں ہوا آپ ہمیں بتائیں۔''

تفضّل کے امی نے کہا: ''یہ حادثہ آج سے 20 دن پہلے ہوا۔'' پھر انھوں نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ''وہ ہمارے خسر صاحب کا کمرہ ہے۔ اسی میں ان کا پلنگ بچھا ہوا ہے۔ وہ بہت دنوں سے بیمار تھے۔ میرے شوہر کو شک تھا کہ انھوں نے پرکھوں کی دولت کا کچھ حصہ کہیں چھپا کر رکھ دیا ہے۔ اس دولت کو حاصل کرنے

کے لئے وہ بار بار ان پر دباؤ ڈالتے تھے۔ حادثہ والے دن یہ بہت نشے میں تھے۔ رات کو دیر سے لوٹے تھے۔ وہ سیدھے میرے خسر صاحب کے کمرے میں گئے۔ زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے آواز آئی تو میں اپنے خسر کے کمرے میں گئی۔ میں نے دیکھا یہ ان کا گلا دبا رہے تھے اور پوشیدہ دولت کا پتہ پوچھ رہے تھے میں نے انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے، وہ تڑپتے رہے۔ یہ ان کا گلا دباتے رہے اور تھوڑی دیر میں وہ ٹھنڈے ہو گئے۔ اِنھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر مَیں نے کسی کو کچھ بتایا تو یہ میرا بھی گلا گھونٹ کر مار ڈالیں گے۔ انھوں نے ان کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر دیئے۔ مجھے کھینچتے ہوئے میرے کمرے میں لے آئے۔ صبح لوگوں نے میرے خسر کو بستر پر مردہ پایا۔ سب نے سمجھا کہ بیماری سے ان کی موت ہو گئی۔ کسی کو کوئی شک نہیں ہوا۔"

پولیس انسپکٹر نے کہا: "تم نے یہ بات کسی کو بتائی کیوں نہیں؟"

تفضّل کی امی نے کہا: "اپنی جان جانے اور اپنے شوہر کے جیل جانے کے خوف سے میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔ میں کسی سے کچھ کہتی تو یہ شخص مجھے بھی مار ڈالتا۔ اس پوری کوٹھی کی بربادی کا یہی اکیلا ذمہ دار ہے۔"

انسپکٹر نے وہ کمرہ جا کر دیکھا۔ اس دوران تفضّل کے والد نے کچھ نہیں کہا۔ خاموش رہے۔ ان کے پورے سر پر بنڈیج بندھی ہوئی تھی۔

حادثہ کی جگہ کا معائنہ کر کے انسپکٹر تفضّل کے والد کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ اگلے دن انھیں عدالت میں پیش کیا گیا۔ کورٹ سے تفضّل کے دادا جان کی لاش قبر کھود کر نکالنے اور اس کا پوسٹ مارٹم کرانے کی اجازت طلب کی گئی۔ کورٹ نے اس کی اجازت دے دی۔ اسی روز قبر کھودی گئی اور لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا گیا۔ جہاں آسانی سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مرزا فصیح اللہ بیگ صاحب کی موت ان کا گلا گھونٹنے کی وجہ

سے ہوئی تھی۔ انگلیوں کے جہاں کہیں نشانات ملے اس کا عکس بھی لے لیا گیا۔ لاش دوبارہ قبر میں دفن کر دی گئی۔ ان حالات نے تفضّل کے والد کو کمزور کر دیا۔ شراب نہ ملنے سے ان کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ انھوں نے اس بات کا اقرار کرلیا کہ انھوں نے ہی دولت کا پتہ معلوم کرنے کے لئے اپنے والد کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ ان کے اوپر باقاعدہ کیس چلنے لگا۔

یہ ساری کارروائی ہو جانے کے دوسرے دن میں نے تفضّل کی والدہ سے کہا: ''آپا اب میری یہاں کوئی ضرورت نہیں رہ گئی ہے آج رات میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میری وجہ سے آپ کو کچھ تکلیف پہنچی ہو تو میں اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔''

انہوں نے کہا: ''بھائی صاحب یہ کیسی بات کرر ہے ہیں آپ۔ آپ کی وجہ سے اس گھر کے بگڑے ہوئے سارے حالات درست ہو گئے۔ آپ کا تو ہم پر زبردست احسان ہے۔ ایک دو ضروری کام اور رہ گئے ہیں وہ پورے ہو جائیں تو آپ بخوشی چلے جائیں۔ بس دو دن آپ اور رک جائیں۔''

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے میں دو دن اور رک جاتا ہوں۔''

اُسی رات مَیں نے تفضّل سے کہا کہ مجھے آگرہ جانا ہے، کچھ دوستوں سے ملاقات کرنی ہے۔ تاج محل اور دیگر تاریخی مقامات دیکھنا ہے۔ میں صبح کی پہلی ٹرین سے نکل جاؤں گا۔''

تفضّل نے کہا: ''ٹھیک ہے انکل، آپ اپنا کام کر کے آجائیں کل رات میں آپ سے ملاقات ہوگی۔''

میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ صبح چار بجے اُٹھا۔ تیار ہوا اور دہلی ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ جلدی جلدی میں مَیں اپنا موبائل فون جو چارجر پر لگا ہوا تھا لے جانا بھول گیا۔

آگرہ میں دل تاج محلی صاحب سے مراسم تھے۔ ان کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ ان کے ساتھ دن بھر رہا۔ ادبی دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ تاج محل، آگرہ کا قلعہ اور بلند دروازہ وغیرہ دیکھا، شام میں ایک جگہ نشست بھی ہوئی۔ ان سے فارغ ہوکر میں رات کی ٹرین سے واپس دہلی آ گیا۔ رات کے 12 بجے تھے جب میں کوٹھی میں پہنچا۔ کوٹھی میں داخل ہوا تو دیکھا کہ سارے لوگ جاگ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر سب سے پہلے تفضّل کا ماموں عظیم خاں میری طرف لپکا اور میرا ہاتھ تھام لیا اور سخت لہجے میں کہا: ''تفضّل کہاں ہے؟''

اس کے ساتھ ہی گھر کے تمام لوگ مجھے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ تفضّل کے خالو نے آگے بڑھ کر میرا گلا پکڑنا چاہا۔ میں نے اُسے روکا۔ اس نے گندی گالی دی اور مجھ سے چلاّ کر کہا: ''تفضّل کہاں ہے اور اس کے پاس کی ساری رقم کہاں ہے؟''

میں نے کہا: ''نہ تو میں تفضّل کے بارے میں کچھ جانتا ہوں اور نہ اس رقم کے بارے میں، جس کے بارے میں آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ میں تو صبح سویرے ہی آگرہ چلا گیا تھا اور ابھی وہاں سے واپس آ رہا ہوں۔''

عظیم خاں نے چلاّ کر کہا: ''تم تفضّل کو لے کر یہاں سے گئے اور وہ لاکھوں روپئے بھی لے کر گئے جو وہ اپنی ماں کے پاس سے چرا کر لے گیا ہے۔ صبح سے نہ تو تمہارا کچھ پتہ ہے اور نہ ہی تفضّل کا۔ بتاؤ تفضّل کہاں ہے؟''

میں نے کہا: ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں تفضّل کے متعلق کچھ نہیں جانتا، میں اُسے بتا کر آگرہ گیا تھا۔''

تفضّل کے خالو نے کہا: ''یہ ایسے نہیں بتائے گا پولیس کو فون لگاؤ۔ تبھی لڑکے کا اور رقم کا پتہ بتائے گا۔''

میں نے کہا: ''بیشک پولیس کو فون لگائیے میں نے جب کچھ کیا ہی نہیں ہے تو مجھے

ڈر کس بات کا ہے۔"

اُسی وقت عظیم الدین خاں نے پولیس تھانے میں فون لگایا اور موبائیل پر کہا کہ اس نے جس شخص کے خلاف رپورٹ لکھوائی ہے وہ گھر میں آ گیا ہے۔ لڑکا اس کے ساتھ نہیں ہے۔

کچھ دیر بات کر کے اس نے فون رکھ دیا۔ پھر تفضّل کے خالو کو مخاطب کر کے کہا:

"وہ کہہ رہے ہیں کہ اُسے لے کر تھانے آ جاؤ۔"

میں نے کہا: "چلو پولیس تھانے! میں چلنے کو تیار ہوں۔"

آخر وہ مجھے لے کر پولیس تھانے آئے۔ وہاں ایک سب انسپکٹر اور چار پولیس والے موجود تھے رات کے ایک بج چکے تھے۔ وہاں پہنچ کر عظیم خاں نے سب انسپکٹر کو بتایا کہ اُس نے دن میں بچے کی گمشدگی اور رقم کے چوری ہونے کی رپورٹ لکھوائی تھی یہ ابھی رات میں کوٹھی سے اپنا سامان لے جانے آیا تو ہم نے اسے پکڑ لیا۔"

سب انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا: "لڑکا کہاں ہے اور رقم کہاں ہے؟"

میں نے کہا: "میں نہ تو لڑکے کے بارے میں کچھ جانتا ہوں اور نہ ہی رقم کے بارے میں۔ میں صبح کی گاڑی سے آگرہ چلا گیا تھا اور میں نے تفضّل کو یہ بات بتا دی تھی۔ ابھی آگرہ سے لوٹ کر آیا تو ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں میں تفضّل کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔"

سب انسپکٹر نے کہا: "دیکھو ان کے گھر سے دس لاکھ کی رقم چوری ہوئی ہے اور لڑکا بھی غائب ہے۔ تمہارے سوا اُسے کون لے جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا: "انسپکٹر صاحب میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں لڑکے اور رقم کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔"

پولیس انسپکٹر نے کہا: "تم آگرہ میں کہاں تھے؟"

میں نے کہا: ''مجھے تاج محل دیکھنا تھا، آگرہ کا قلعہ دیکھنا تھا، فتح پور سیکری کا بلند دروازہ اور شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار مبارک پر حاضری دینی تھی، کچھ دوستوں سے ملاقات کرنی تھی۔ سو یہ سب کام انجام دے کر میں رات کی ٹرین سے دہلی واپس آ گیا۔''

عظیم خان نے کہا: ''جناب یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اسی نے لڑکے کو کہیں چھپا کر رکھا ہے۔ رقم بھی اس کے پاس ہی ہوگی۔ آپ سختی کریں تبھی یہ سچ بات بتائے گا۔''

انسپکٹر نے کہا: ''ٹھیک ہے آپ ہمیں ہدایت نہ دیں۔ ہم اپنے طریقے سے کارروائی کریں گے۔ اب آپ لوگ جائیں اور صبح آ کر انسپکٹر صاحب سے ملاقات کرنا۔'' پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا: ''پروشوتم، انھیں حوالات میں بند کر دو۔''

ایک سپاہی نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس نے مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ تبھی عظیم الدین خاں سب انسپکٹر کے قریب آیا۔ آہستہ آہستہ اس سے کچھ دیر بات کرتا رہا پھر اس نے اپنے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ رقم نکال کر اس نے سب انسپکٹر کے ہاتھ میں دی اور پھر کوٹھی سے آنے والے سارے لوگ وہاں سے چلے گئے۔

میں حوالات میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ دو لوگ حوالات کے کمرے میں اور بھی تھے جو بے خبر سو رہے تھے۔ میں ایک کونے میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ کس الجھن میں میں پڑ گیا اور تفضل رقم لے کر کہاں غائب ہو گیا۔

حوالات میں بیٹھے بیٹھے میں اونگھنے لگا۔ تبھی دروازہ کھلا اور ایک سپاہی نے مجھ سے کہا کہ مجھے صاحب بلا رہے ہیں۔

میں وہاں سے اٹھ کر اس جگہ آیا جہاں سب انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو مجھ سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ جب میں کرسی پر بیٹھ گیا تو مجھ سے پوچھا کہ میں یہاں کیسے آیا اور لڑکے کا کیا ہوا؟

میں نے ناگپور سے دہلی آنے تک کی پوری کہانی اُسے سنا دی صرف زیورات

کے ملنے بات اسے نہیں بتائی اور آگرہ جانے کی بات بھی اُسے بتا دی۔ اس نے کئی طرح گھما پھرا کر مجھ سے سوالات پوچھے لیکن جو کچھ سچ تھا میں نے اُسے بتا دیا۔ آگرہ میں جانے آنے اور الگ الگ جگہوں سے جو ٹکٹیں میں نے خریدی تھیں وہ بھی اُسے دکھا دیں۔ اسے میری باتوں میں سچائی نظر آئی۔ آخر اس نے کہا: ''ان لوگوں نے تمہارے خلاف لڑکے کا اغوا کرنے اور دس لاکھ روپے چوری کرنے کی رپورٹ لکھوائی ہے۔ جب تک لڑکا نہیں مل جاتا ہم تمہیں چھوڑ نہیں سکتے۔'' اتنا کہہ کر وہ مجھے حوالات کے دوسرے کمرے میں لے کر آیا۔ اس کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ وہاں ایک کرسی رکھی ہوئی تھی اس نے مجھے اس پر بیٹھنے کو کہا۔ جب میں بیٹھ گیا تو اس نے مجھ سے نہایت سخت لہجے میں کہا: ''دیکھو مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو کہ لڑکا کہاں ہے اور دس لاکھ روپے تم نے کہاں چھپا کر رکھے ہیں؟''

میں نے کہا: ''انسپکٹر صاحب میں کہہ چکا ہوں کہ میں نہ تو لڑکے کے متعلق کچھ جانتا ہوں اور نہ ہی مجھے دس لاکھ روپیوں کا کچھ علم ہے۔''

میری بات سن کر اس نے ایک زوردار طمانچہ میرے گال پر مارا اور حوالدار سے کہا: ''پروشوتم، یہ ایسے کچھ نہیں بتائے گا۔ جاؤ الماری میں سے نائلون کی رسی لے کر آؤ۔ اسے باندھ کر لٹکایا جائے گا تب ہی یہ سب کچھ صحیح صحیح بتائے گا۔''

سب انسپکٹر کی بات سن کر حوالدار کمرے سے چلا گیا۔ تب سب انسپکٹر نے پھر مجھ سے نہایت نرمی سے کہا: ''دیکھو مجھے سب کچھ صحیح صحیح بتا دو۔ تم مار کھانے سے بچ جاؤ گے۔ میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔ اچھے اچھے بدمعاشوں کو سیدھا کر چکا ہوں۔ تم چند گھنٹوں میں ہی ساری سچائی اگل دو گے۔''

میں نے کہا: ''صاحب آپ کو جو کرنا ہے کر لو میں نے جو کہا وہی سچ ہے۔ آپ مجھے بلاوجہ اذیت نہیں پہنچا سکتے۔''

سب انسپکٹر نے کہا: ''ابھی تجھے پتہ چل جائے گا۔ میں تیرے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ تجھے نہیں معلوم میں کتنا حرامی آدمی ہوں۔ دیکھ اپنے آپ کو میرے خوفناک ظلم سے بچالے اور لڑکے اور دس لاکھ کی بات مجھے بتادے۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا حوالدار نائلون کی رسی لے کر حوالات کے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے سب انسپکٹر سے کہا: ''انسپکٹر صاحب اگر آپ نے میرے ساتھ غلط رویہ اپنانے کی کوشش کی تو میں پولس کمشنر سے آپ کی شکایت کردوں گا۔ یہاں دہلی میں میرے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔''

اس نے کہا: ''ٹھیک ہے نا، میرے خلاف پولس کمشنر کیا ہوم منسٹر سے شکایت کردینا۔'' اتنا کہہ کر اس نے مجھے زبردستی کرسی پر بٹھادیا اور حوالدار اور سب انسپکٹر نے مل کر مجھے رسی سے کرسی پر اچھی طرح باندھ دیا اور پھر اس کرسی کو چھت سے لگے ہوئے ایک ہک میں ڈال کر کرسی کو ہوا میں لٹکا دیا۔ رسی کو کھڑکی کی سلاخ سے باندھ دیا۔ میں رسی کے سہارے کرسی پر بیٹھا ہوا، ہوا میں لٹکنے لگا۔ پھر اس نے کرسی کو گول گول چکر دیئے، پھر اسے اچانک چھوڑ دیا۔ میں دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں گھومنے لگا۔ دس منٹ تک وہ اور حوالدار مجھ پر یہ عمل کرتے رہے۔ مجھے ابکائی سی آنے لگی، سر چکرانے لگا، طبیعت عجیب طرح متغیر ہونے لگی۔ پیٹ میں عجیب سی اینٹھن ہونے لگی۔ پھر کرسی کو اس نے روکا، پھر سے مجھ سے وہی سوال کیا کہ لڑکا کہاں ہے اور روپے کہاں رکھے ہوئے ہیں۔''

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا، رات میں سب انسپکٹر نے دو تین بار یہی سلوک میرے ساتھ کیا اور آخر مجھ پر بے ہوشی طاری ہوگئی اور شاید وہ مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔

نہ جانے رات تھی یا صبح ہو چکی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا، میں اسی طرح کرسی سے

بندھا ہوا، ہوا میں لٹک رہا تھا۔

صبح پانچ بجے تفضّل کی والدہ اپنی بیٹی کے ساتھ پولیس تھانے میں آئیں۔ انھوں نے پولیس انسپکٹر سے کہا کہ یہ بے قصور ہیں۔ میرا لڑکا ہی پیسے لے کر غائب ہوگیا ہے میرے گھر کے لوگ اس رقم کے لالچ میں انھیں گرفتار کروانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ہماری بڑی مدد کی ہے۔ یہ چوری کیوں کریں گے۔ نہ تو ان کا ہاتھ چوری میں ہے اور نہ ہی لڑکے کو اغوا کرنے میں۔ میری ضمانت پر انہیں چھوڑ دیجئے۔

سب انسپکٹر نے کہا: ''جن لوگوں نے شکایت درج کروائی ہے وہ لوگ اگر شکایت واپس لیں گے تب ہی میں انھیں چھوڑوں گا۔ یا پھر لڑکے کو یہاں پیش کرو تو میں انھیں چھوڑ دیتا ہوں۔''

تفضّل کے امی نے بہت منت سماجت کی لیکن انسپکٹر راضی نہ ہوا۔ وہ بے چاری روتی ہوئی وہاں سے واپس چلی گئیں۔

صبح 9 بجے پھر سے تفضّل کے خالو اور اس کے ماموں بستی کے کچھ بااثر لوگوں کو لے کر وہاں آگئے۔ سب انسپکٹر پر دباؤ ڈالنے لگے کہ میری اچھی پٹائی کریں تب ہی میں سب کچھ صحیح صحیح بتاؤں گا۔

سب انسپکٹر نے کہا: ''ہم نے رات بھر اسے چھت سے لٹکائے رکھا اور اپنے طریقے سے پوچھ کر دیکھ لیا لیکن اس نے کوئی نئی بات نہیں بتائی ہے۔ وہ دیکھو وہ کرسی سے بندھا لٹک رہا ہے۔ آج ہم اسے کورٹ میں پیش کریں گے اور ان کی تین دن کی پولیس حراست (PCR) کی درخواست کریں گے۔ یہ آگے کے تین دن حوالات میں ہمارے پاس ہی رہیں گے۔ تب تک آپ لڑکے کو تلاش کرتے رہیں، کہیں کچھ خبر ملے تو ہمیں اطلاع دیں۔ لڑکا نہیں ملا تو پھر ہم ان سے معلوم کرلیں گے کہ لڑکا کہاں ہے اور رقم کہاں ہے۔''

وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ جاتے جاتے انھوں نے کہا کہ کورٹ میں ہم اپنا وکیل بھی کھڑا کریں گے۔ تھوڑی دیر میں تھانے میں، تھانہ انچارج بھی آ گیا۔ اس نے حوالات کے کمرے میں مجھے یوں کرسی پر چھت سے لٹکتے ہوئے دیکھا تو سب انسپکٹر سے میری بابت پوچھا۔ سب انسپکٹر نے میرے تعلق سے ساری باتیں اسے بتادیں۔
انسپکٹر نے سب انسپکٹر سے کہا: ''فوراً اسے کرسی سے کھولو اور اچھی طرح منھ ہاتھ دھلا کر یہاں میرے سامنے لے کر آؤ۔ جاؤ جلدی کرو۔''

انسپکٹر کی بات سن کر سب انسپکٹر میرے کمرے میں آیا۔ اس نے رسی کھول کر مجھے نیچے اتارا اور مجھے کرسی سے آزاد کر دیا۔ مجھے اپنے ساتھ باتھ روم لے کر گیا اور مجھ سے کہا کہ میں اچھی طرح منھ ہاتھ دھولوں۔ باتھ روم میں جا کر میں نے اچھی طرح سے منھ ہاتھ دھویا۔ بالوں میں کنگھی کی، پھر سب انسپکٹر نے مجھے انسپکٹر کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ انسپکٹر نے مجھ سے سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سپاہی سے میرے لیے چائے منگوائی۔ میں نے چائے پی لی تو انسپکٹر نے مجھ سے میرے تعلق سے اور اس معاملے کے تعلق سے پوچھا۔ میں نے ساری باتیں اسے سچ سچ بتادیں۔

انسپکٹر نے میری باتیں سنیں اور پھر مجھ سے کہا: ''یہاں اس شہر میں تمہارا کوئی جان پہچان کا شخص ہو تو بتاؤ۔''

میں نے ڈاکٹر خوشحال زیدی صاحب، عادل اسیر دہلوی، اردو اکادمی کے انیس اعظمی اور عزیز حسن صاحب کے نام اُن کو بتائے اور یہ بھی بتایا کہ میں ایک رائٹر ہوں۔ میری کچھ کتابیں یہاں ترقی اردو بیورو اور دہلی اردو اکادمی کی جانب سے شائع ہو چکی ہیں۔

اس نے کہا: ''ان میں سے کسی کو یہاں بلوا سکتے ہو؟''

میں نے کہا: ''ہاں کیوں نہیں۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی صاحب میرے بڑے بھائی

جیسے ہیں۔ میں انہیں فون کر کے بلوا سکتا ہوں۔"

میں نے ڈائری سے خوشحال زیدی صاحب کا فون نمبر نکالا اور پولیس تھانے کے فون سے انہیں فون لگایا۔ فون لگ گیا تو ساری باتیں۔ انھیں بتائیں، میری بات سن کر انھوں نے کہا: "ارے کل صبح وہ لڑکا میرے گھر آیا تھا اور مجھ سے کہا کہ ہمارے گھر کے معاملات سلجھ چکے ہیں۔ میرے امّی نے وہ باکس منگوایا ہے۔ اس نے کافی ضد کی تو میں نے وہ باکس اُسے دے دیا۔"

میں نے کہا: "یہاں گھر سے بھی وہ کافی رقم۔ لے کر غائب ہوا ہے۔"

زیدی صاحب نے کہا: "اچھا تم فکر مت کرو۔ میں فوراً تھانے پہنچ رہا ہوں۔"

آدھے گھنٹے میں وہ تھانے پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ ایک وکیل صاحب بھی تھے، پولیس انسپکٹر نے انہیں عزّت سے بٹھایا۔ وکیل صاحب انسپکٹر کے شناسا تھے۔ زیدی صاحب نے میری بابت ساری باتیں پولیس انسپکٹر کو بتائیں اور کہا کہ وہ میری ضمانت لینے کو تیار ہیں۔ اسی وقت میری ضمانت کے کاغذات تیار ہوئے اور مجھے رہا کر دیا گیا۔ زیدی صاحب نے کہا کہ میں اپنا سامان کوٹھی سے اٹھا کر ان کے گھر میں لے آؤں۔

میں ان سے رخصت ہو کر کوٹھی پہنچا۔ مجھے دیکھ کر کوٹھی کے لوگ حیران رہ گئے۔ عظیم الدین خاں نے تھانے میں فون کیا تو پولیس انسپکٹر نے بتایا کہ انھیں ضمانت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس نے بہت سخت باتیں کہیں۔ کمشنر آف پولیس میں شکایت وغیرہ کی باتیں کیں لیکن انسپکٹر نے اس کی ایک نہ سنی۔ میں نے اپنا سامان سمیٹا اور باہر نکل کر آیا۔ اسکول کے سامنے بڑی بی بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھا تو اپنے پاس بلایا اور پوچھا یہ سب کیا ہوا۔ میں نے تفضّل کے غائب ہونے کی بات انھیں بتائی تو وہ ہنس پڑیں۔ مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے حیران ہو کر کہا: "اماں اس میں ہنسنے والی بات کیا ہے؟"

انھوں نے کہا: ''تجھے نہیں معلوم۔ تو کچھ نہیں جانتا۔ میں جانتی ہوں۔ وہ کہاں گیا ہوگا۔''

''اچھا'' مجھے ان کے پر اعتماد لہجے پر حیرت ہوئی۔ میں نے کہا: ''بتایئے وہ کہاں گیا ہے۔''

انھوں نے کہا: ''وہ گیا ہے میرٹھ؟''

''میرٹھ؟ میرٹھ کس کے گھر؟''

''بیٹا۔ میرٹھ میں اس کی پھوپھی رہتی ہے۔ بچپن میں اُس نے ہی اسے بڑے لاڈ پیار سے پالا ہے۔ لیکن کسی بات پر اس کے امی سے اُس کی کچھ کہا سنی ہوگئی تھی۔ شادی کے بعد وہ میرٹھ چلی گئی لیکن ان کے تعلقات کچھ اچھے نہ ہونے پائے۔ بڑے مرزا صاحب نے بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کی تھی۔ بڑا جہیز دان دیا تھا۔ یہاں جب چھوٹے مرزا (تفضّل کے والد) کو گھر میں کچھ نہ ملا تو اپنی بہن کے گھر گیا۔ لڑائی جھگڑا کر کے مار پیٹ کر کے وہاں سے سارا سامان اٹھالایا۔ بازار میں بیچ دیا اور جوئے شراب میں خرچ کر دیا۔ اِس لڑکے کا پھوپھا اتنا نیک آدمی ہے کہ اس نے اپنی گھریلو زندگی پر اس کی آنچ نہیں آنے دی۔ وہ اپنے روزگار دھندے میں مست رہا۔ یہ ساری باتیں تفضّل کو معلوم ہیں۔ اب جبکہ اس کا باپ جیل میں ہے۔ دادا کا انتقال ہوگیا ہے تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ وہیں گیا ہوگا۔ اس کے باپ نے ان کا جو نقصان کیا ہے بیٹا اُس کی بھرپائی کرے گا۔ یہ لڑکا بھی بڑے گن والا ہے۔ میرا یقین ہے کہ وہ وہیں میرٹھ میں ملے گا۔''

''کیا اس کے امی کا خیال اس طرف نہیں گیا ہوگا؟''

''نہیں اس کا خیال ادھر نہیں گیا ہوگا۔ وہ تو اپنی رشتہ داری کی کتاب میں سے اس کا نام مٹا چکی ہے۔ بیٹے کو اپنی پھوپھی سے کیسی محبت ہے وہ نہیں جانتی۔''

"کیا آپ کو میرٹھ میں ان کا پتہ معلوم ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ میرٹھ کی جامع مسجد کے دروازے کے سامنے اس کے میاں کا گھر ہے اور اسی گھر میں کرانہ کی بڑی دوکان ہے۔ "امتیاز کرانہ اسٹورس" وہی امتیاز میاں اس کے شوہر ہیں۔ بس تفضّل تم کو وہیں ملے گا۔ میری بات کا یقین کرو۔"

میں عجیب کشمکش میں پڑ چکا تھا۔ فوراً میں نے فیصلہ کرلیا کہ مجھے میرٹھ جانا چاہیے۔ میں نے اپنا سوٹ کیس بڑی بی کے حوالے کیا اور ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔

میرٹھ کی طرف جانے والی ٹرین میں بیٹھ گیا اور شام کے وقت میرٹھ پہنچ گیا۔

جامع مسجد کے بالکل سامنے دو منزلہ پکے مکان میں کرانہ کی بڑی دوکان تھی۔ اردو اور ہندی میں وہاں بورڈ لگا ہوا تھا "امتیاز کرانہ اسٹورس"۔ میں رکشہ سے اتر کر کرانہ کی دوکان کی طرف بڑھا اور میں نے دیکھا کہ اندر ایک کرسی پر تفضّل اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر امتیاز کو جو اس کی بغل میں بیٹھے سامان کی چٹھی لکھ رہے تھے زوردار آواز میں سلام کیا۔ وہ چونک گئے۔ سلام کا جواب دیا۔ مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ تفضّل نے بھی میری طرف دیکھا اور مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوگئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے مخاطب کر کے کہا: "آیئے انکل اندر آجایئے۔" وہیں دکان میں کاؤنٹر سے لگا ہوا ایک کھلنے بند ہونے والے پٹ کا دروازہ تھا میں اس سے اندر داخل ہوا۔ امتیاز مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ تفضّل نے کہا: "پھوپھا جان۔ یہی ہیں وکیل نجیب صاحب جو ناگپور سے میرے ساتھ دلی آئے تھے۔"

انھوں نے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور تفضّل سے کہا: "جاؤ انہیں گھر میں لے جاؤ۔"

ہم دکان سے نکل کر باہر آئے، بائیں جانب سڑک مڑی تھی وہیں سے مکان میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔ میں تفضّل کے ساتھ اندر مکان میں داخل ہوا۔ یہ ایک خوبصورت سا جدید طرز کا بنا ہوا بیٹھک کا کمرہ تھا۔ اچھی طرح سجا ہوا تھا۔ ساری چیزیں

سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ تفضّل نے اندر سے جگ اور گلاس میں پانی لایا اور ٹیبل پر رکھ دیا۔ میں نے پانی پیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک خاتون کمرے میں آئیں۔ مجھے سلام کیا۔ تفضّل نے کہا: ''یہ میری پھوپھی ہیں۔'' نہایت معصوم چہرے والی وہ انتہائی خوبصورت خاتون تھیں۔ شکل تفضّل سے ملتی جلتی تھی۔ وہ صوفے پر ایک کونے میں بیٹھ گئیں پھر انھوں نے کہا: ''بھائی جان آپ نے ان لوگوں پر بڑا احسان کیا۔ ان کے سارے معاملات سلجھا دیئے۔ یہ لڑکا تو پگلا ہے کسی کو کچھ بتائے بغیر یہاں چلا آیا اور دیکھئے نا یہ سارے زیورات اور یہ رقم بھی اٹھا کر لے آیا۔ مجھے ان میں سے کچھ بھی نہیں لینا ہے۔ میرے بھائی نے ہمارے ساتھ جو کیا۔ اس کا انجام اب اسے بھگتنا ہی ہے۔ برائی کی سزا دیر سبیر مل کر ہی رہتی ہے۔ اچھا ہوا آپ یہاں آ گئے۔ کل یہ اسکول چلا جائے گا۔ آپ یہ سارے زیورات اور یہ رقم اپنے ساتھ لے جائیں اور اس کے امی کو دے دیں۔ اللہ کے فضل سے ہمیں یہاں کسی بات کی کوئی کمی نہیں ہے اور کوئی لالچ بھی نہیں ہے۔ اس کے پھوپھا اتنے صبر اور شکر والے انسان ہیں کہ میں سمجھتی ہوں دنیا میں شاید ہی ایسا کوئی دوسرا آدمی ہوگا۔ اس کے باپ نے ان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ گالی گلوچ مار پیٹ سب کچھ کر ڈالا۔ میرے جہیز کا سارا سامان سارے زیورات اٹھا کر لے گیا۔ انھوں نے اف تک نہیں کی کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ اس نے اپنے باپ کو مار ڈالا۔ آج اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ ظلم کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اللہ سب کا بھلا کرے۔''

میں حیرانگی کے عالم میں اس عورت کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا آج بھی دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ نیکی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس کا اجر اللہ کی طرف سے ضرور ملتا ہے چاہے اس میں دیر ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے تفضّل کی پھوپھی سے کہا: ''بٹیا تم بڑی نیک عورت ہو اور تمہارے شوہر تو فرشتہ ہیں۔ اللہ تم لوگوں کو سلامت رکھے۔''

پھر اس نے کہا: ''بھائی صاحب آپ فون کر کے اس کے امی کو بتا دیں کہ یہ یہاں ہے اور کل یہ اپنے اسکول چلا جائے گا۔ آپ یہ امانت بھابی جی کو پہنچا دینا۔ امید ہے کہ اب حالات ٹھیک ہو جائیں گے اور ہاں آج آپ یہاں قیام کریں گے۔ رات کا کھانا یہیں ہمارے گھر میں کھائیں گے'' پھر انہوں نے تفضّل کی طرف دیکھ کر کہا: ''جاؤ بیٹا انہیں شہر گھما لاؤ۔''

تفضّل میرے ساتھ باہر آیا۔ میں نے موبائل پر تفضّل کے امی کو میرٹھ کی بات بتا دی اور کہا کہ وہ اطمینان رکھیں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پولیس تھانے میں جا کر اطلاع دے دیں کہ تفضّل مل گیا ہے اور رقم بھی مل گئی ہے۔''

ہم نے ایک باغ میں بیٹھ کر باتیں کیں۔ تفضّل نے اپنی جیب سے ایک سونے کا خوبصورت مڈل نکالا اور میرے ہاتھ میں رکھ دیا اور مجھ سے کہا: ''یہ سونے کا مڈل میرے دادا جی نے خاص طور سے میرے لئے بنوایا تھا یہ بھی انہیں زیورات میں مجھے ملا ہے میں نے اسے نکال کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ یہ مڈل میرے لئے بہت لکی ہے۔ جب تک یہ مڈل میرے پاس رہا میں ساری مصیبتوں سے محفوظ رہا۔'' اچانک اس نے شمال کی سمت دیکھا اور غیر شعوری طور پر اس کے منہ سے نکلا، دیکھئے: ''انکل برف پگھل رہی ہے۔'' میں نے شمال کی طرف دیکھا وہاں مجھے سفید سفید بادل نظر آئے۔ میں نے رواروی میں کہہ دیا: ''ہاں برف پگھل رہی ہے۔ پھر میں غور سے اس مڈل کو دیکھتا رہا۔ دو ڈھائی تولے سونے کا مڈل تھا۔ اس میں دو لائن میں چھوٹے چھوٹے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ میں اسے دیکھنے میں ہی محو تھا کہ اچانک باغ میں موجود لوگ ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ پولیس بھی دوڑتی بھاگتی نظر آئی۔ ہم لوگ بھی جلدی سے اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور بھاگتے ہوئے مین گیٹ کی طرف بڑھے۔ باغ سے باہر نکل کر آئے۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ پولیس والوں کو خبر ملی تھی کہ کچھ دہشت گرد باغ میں موجود ہیں۔ ان

پر پولیس نے حملہ کیا اور یہ بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ میں نے دیکھا تو باہر تفضّل کا پتہ نہ تھا۔ اُسے اِدھر اُدھر تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جامع مسجد کے سامنے پہنچ گیا۔ تفضّل وہاں گھر میں موجود تھا۔

رات کا کھانا کھا کر میں وہیں سو گیا۔ سویرے ذرا دیر سے اٹھا۔ معلوم ہوا کہ صبح پانچ بجے کی تفضّل کی ٹرین تھی۔ وہ اپنے اسکول پنچ گنی کے لئے روانہ ہوگیا ہے تفضّل کے پھوپھی نے مجھے وہ رقم دی جو تفضّل اپنے گھر سے لے کر فرار ہوا تھا اور وہ باکس بھی دیا جس میں وہ سارے زیورات رکھے ہوئے تھے۔ اس کی چابیاں بھی مجھے سونپ دیں۔ میں وہاں سے نکلا اور دہلی پہنچ گیا۔

دہلی پہنچ کر میں نے وہ باکس اور رقم تفضّل کے امی کو دے دی۔ اُسی وقت عظیم الدین خاں وہاں آیا اور اپنی بہن کو مخاطب کر کے کہا: ''آپا آپ اس آدمی پر بھروسہ مت کیجئے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے بھی اس میں سے بہت سی رقم اپنے پاس رکھ لی ہے۔

تفضّل کی والدہ نے کہا: ''تو مجھے ان کی بابت کچھ نہ کہہ وہ اگر چاہتے تو یہ پوری دولت اپنے قبضے میں کر سکتے تھے۔''

عظیم الدین خاں نے کہا: ''آپا تم اپنے سیدھے پن کی وجہ سے ہی نقصان اٹھا رہی ہو۔ میں کہتا ہوں اس آدمی کے سامان کی تلاشی لو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں، تمہاری رقم کا ایک بڑا حصہ اس کے پاس ملے گا۔''

میں نے اس کے منہ سے یہ باتیں سنیں تو میں نے کہا: ''بے ایمان آدمی کو ہر آدمی بے ایمان نظر آتا ہے۔ میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ مَیں اس گھر کے لوگوں کے ساتھ نمک حرامی کبھی نہیں کروں گا۔ ہر آدمی کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہئے۔''

میری اس بات کو سن کر وہ غصے سے بے قابو ہوگیا۔ مجھے گالیاں دینے لگا اور آگے

بڑھ کر مجھ پر ہاتھ اٹھانا چاہا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور زوردار گھونسہ اس کے منہ پر مارا۔ وہ بری طرح زمین پر گر پڑا۔ اِس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ اس کی بیوی بھی اس وقت وہاں موجود تھی اس نے یہ منظر دیکھا تو وہ دوڑ کر اس کے پاس گئی اور پھر دونوں مل کر مجھے گالیاں دینے لگے۔ تفضل کی والدہ نے بھی میرے ایسا کرنے پر مجھے برا بھلا کہا۔ تب میں نے تفضل کے امی کو مخاطب کر کے کہا: ''آپا تم اپنے بھائی کی حمایت کر رہی ہو، تمہارے گھر کا سب سے بڑا دشمن یہی تمہارا بھائی ہے۔ تفضل کے والد کو شراب، جوئے کی لت لگانے والا یہی ہے۔ سنئے میں ان کو جھونکنے والا یہ آدمی ہے۔ اس کوٹھی پر جو بربادی آئی ہے اس کا پورا ذمہ دار یہ ہے۔''

میری باتیں سن کر وہ تو بھڑک اٹھا۔ پھر سے مجھ پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا اور بے تحاشہ گالیاں دینے لگا اور کہا کہ نہ جانے کہاں سے اس گھر میں آ گیا۔ مجھے بدنام کر رہا ہے۔ میری ایمان داری پر کیچڑ اچھال رہا ہے۔''

میں نے کہا: ''تو اپنے آپ کو ایماندار کہتا ہے، ارے تجھ سے بڑا اس گھر کا اور اس خاندان کا کوئی دشمن نہیں ہے۔''

اس نے طیش میں آ کر کہا: ''مجھ پر جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ میری بے ایمانی کو ثابت کر نہیں تو ابھی میں تیرا خون پی جاؤں گا۔''

میں نے کہا: ''ہاں میں ثابت کرتا ہوں۔ مرزا صاحب کو شراب اور جوئے کی لت لگا کر تو نے دوکان کا سارا مال جمنا پار پہنچا دیا۔ وہاں تو نے مکان خریدا، دوسری عورت کو رکھا اور اس کے بھائیوں کو کپڑوں کی دوکان لگا کر دی۔ مجھے بتا کہ وہ ''فرینڈس کلاتھ اسٹورس'' کس کی دوکان ہے اور تو مرزا صاحب کو دارو کی دکان پر بیٹھا کر جمنا پار کے مکان میں دن بھر کیا کرتا رہتا ہے۔''

میری اس بات کو سن کر اس کے ہوش اُڑ گئے۔ واہی تباہی بکنے لگا۔ میں نے تفضل

کے امی سے کہا: ''آپا آپ ابھی میرے ساتھ جمنا پار کی بستی میں چلیئے اس کی ساری حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی۔ آپ کے اس گھر کی بربادی کا پورا پورا ذمہ دار یہی تمہارا بھائی ہے۔''

عظیم الدین خاں نے چلاّ کر کہا: ''نہیں آپا یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں بھاگا اور پیچھے کے دروازے سے نکل کر کوٹھی سے باہر بھاگ گیا۔ میں نے تفضل کے امی سے کہا: ''وہاں اس کی لاکھوں روپئے کی پراپرٹی ہے۔ بڑا امکان ہے، بڑی عالیشان دکان ہے اور اس کی دوسری عورت کے بھائی وہاں شاندار زندگی گذار رہے ہیں۔ مرزا صاحب کی دکان کا سارا مال وہاں پہنچ گیا ہے۔ اگر میری بات جھوٹ تھی تو وہ یہاں سے بھاگا کیوں؟ میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ بھاگ کر وہیں گیا ہوگا تاکہ ان لوگوں کو سب سمجھا سکے۔ میں کہتا ہوں آپ ابھی میرے ساتھ جمنا پار چلیں میں اس کا مکان، اس کی دکان آپ کو دکھاتا ہوں اور اس کی بیوی سے آپ کو ملاتا ہوں۔''

اس کی بیوی نے یہ بات سنی تو رونے چلاّنے لگی اور مجھے ہی برا بھلا کہنے لگی۔

میں نے کہا: ''ایک ٹیکسی کرلو اور ابھی جمنا پار میرے ساتھ چلو۔ ابھی سارا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی سامنے آجائے گا۔''

اس کی بیوی نے کہا: ''نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میرے شوہر پر الزام لگا رہے ہو، انھیں بدنام کررہے ہو۔''

میں نے کہا: ''چلو میرے ساتھ اپنی آنکھ سے سب کچھ دیکھ لو۔''

وہ لوگ چلنے کو تیار ہوگئے۔ میں اسٹینڈ سے دو آٹو رکشہ لے آیا۔ تفضل کی والدہ ان کی بیٹی اور میں ایک رکشہ میں بیٹھ گئے۔ دوسرے رکشے میں عظیم الدین کی بیوی اور اس کے دونوں بچے بیٹھ گئے۔ پون گھنٹے میں ہم جمنا پار اس کے مکان کے سامنے پہنچ

گئے۔اپنے گھر کے سامنے اتنے لوگوں کو دیکھ کر وہ لوگ گھبرا گئے۔دکان میں جا کر میں نے پوچھا:''عظیم بھائی کہاں ہیں؟''

وہاں جو لڑکا بیٹھا تھا اس نے کہا:''وہ ابھی نہیں آئے ہیں۔12 بجے تک آئیں گے۔''

میں نے کہا:''وہ تمہارے کون ہوتے ہیں؟''

اس نے کہا:''وہ ہمارے بھائی صاحب ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا:''تمہاری بہن کہاں ہیں؟''

اس نے کہا:''گھر میں ہیں۔''

میں نے کہا:''ذرا ان کو بلاؤ۔''

وہ اپنی بہن کو بلا کر لے آیا۔اس کی ماں بھی اس کے ساتھ تھی۔میں عظیم الدین کے ساتھ اُسے دیکھ چکا تھا میں نے تفضّل کے امی سے کہا:''یہ عظیم کی بیوی ہے۔''اس نے میری بات سنی تو اچنبھے میں رہ گئی اور ہم سے پوچھا کہ ہم لوگ کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں؟''

میں نے اس عورت سے کہا:''یہ عظیم الدین کی پہلی بیوی ہیں۔یہ ان کے بچے ہیں اور ان کی بڑی بہن ہیں۔''

یہ سن کر تو اس کے ہوش اڑ گئے۔اس نے چلاّ کر کہا:''اس کا یہاں کچھ بھی نہیں ہے یہ مکان یہ دکان میری ہے۔چلو تم لوگ یہاں مجمع مت لگاؤ فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔''

ہماری باتیں چل ہی رہی تھیں کہ عظیم بھی وہاں آ گیا۔اس نے اپنی بیوی اور بہن کو وہاں دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے وہ مجھے مارنے کے لئے آگے بڑھا۔اس کی بہن نے آگے بڑھ کر اسے روکا اور اپنے پیر کی چپل نکال لی اور اس سے اس کی پٹائی کر دی۔اس کی بیوی نے بھی اپنی چپل نکالی اور دونوں نے مل کر اُسے بری طرح پیٹ کر رکھ دیا۔وہ بے تحاشہ مجھے گالیاں دے رہا تھا۔موقع کا فائدہ اٹھا کر میں نے بھی دو چار

زوردار گھونسے اُسے جما دیئے۔ وہاں لوگ کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اسے برا بھلا کہتے ہوئے ہم لوگ جس رکشے سے آئے تھے اسی رکشے سے واپس ہو گئے۔ کوٹھی میں پہنچے تو وہاں کا عجیب عالم تھا یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کسی کی میت ہوگئی ہے۔ میں نے سوچا کہ اب یہاں ایک منٹ بھی رکنا مناسب نہیں ہے۔ میں نے بڑی بی کے پاس سے اپنا سامان لیا۔ وہیں سے آٹو رکشہ پہ بیٹھا اور سیدھے دہلی ریلوے اسٹیشن آ گیا۔ میں نے ٹکٹ کے پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو میرے ہاتھ میں تفضّل کا وہ مڈل آ گیا جو اس نے باغ میں مجھے دیکھنے کے لئے دیا تھا جو بھگدڑ کی وجہ سے میری جیب میں رہ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ مڈل اس کے لئے بہت لکی ہے۔ میں نے سوچا کہ پنچ گنی جاتا ہوں۔ یہ مڈل اس کے حوالے کردوں گا۔ وہاں سے ناگپور نکل جاؤں گا۔ یہ سوچ کر میں نے پنچ گنی کا ٹکٹ نکالا اور ٹرین میں بیٹھ گیا۔

تین بجے کا وقت تھا جب میں اسکول میں پہنچا لیکن وہاں کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سارے بچے، اساتذہ، معلمات، اسٹاف کے سارے لوگ اور کچھ ڈاکٹر اسکول کے میدان میں جمع تھے۔ ایک چبوترے پر 5 لڑکوں کی لاشیں سفید چادروں سے ڈھکی ہوئی رکھی تھیں۔ سارے ماحول میں ماتم چھایا ہوا تھا۔ ہر شخص افسردہ اور رنجیدہ چہرے لئے وہاں کھڑا ہوا تھا۔ میں لڑکوں کے بیچ سے گذر کر سامنے جہاں فادر (اسکول کے پرنسپل) کھڑے ہوئے تھے وہاں پہنچا۔ میں نے کہا: ”کیا معاملہ ہے فادر، میں دتی سے تفضّل کریم سے ملنے یہاں آیا ہوں۔“

میرے منہ سے تفضّل کریم کا نام سن کر فادر کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر ابھرا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا آنسوان کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ انھوں نے کہا: ”میں نے ان کے گھر پر فون لگانے کی کوشش کی لیکن ان کے گھر فون ہی نہیں لگ رہا ہے۔ اچھا ہوا آپ یہاں آ گئے۔“

میں نے کہا: ''فادر بات کیا ہے۔ یہ لاشیں کن کی رکھی ہوئی ہیں؟''

فادر نے کہا: ''آج سے پندرہ دن پہلے ہمارے اسکول کی ایک خاص ٹرپ کلو، منالی اور روہتانگ گئی ہوئی تھی۔ یہ پانچوں بچے اسپیشل ٹریننگ کے لئے پٹھان کوٹ جارہے تھے۔ جس کار میں یہ پانچ بچے تھے وہ روہتانگ میں برف باری میں پھنس گئی اور سڑک سے لڑھک کر نیچے برف کے میدان میں دھنس گئی۔ برف باری کی وجہ سے پوری کار برف میں دب گئی۔ ہم یہ سمجھتے رہے کہ بچے ٹریننگ میں مصروف ہیں۔ دو روز پہلے جب دھوپ نکلی برف صاف ہوئی تو لوگوں کو برف میں دبی ہوئی کار نظر آئی۔ فوج کے جوانوں نے کار کو باہر نکال لیا۔ اس حادثہ میں پانچوں لڑکوں کی موت واقع ہو چکی تھی اور ابھی ایک گھنٹہ قبل یہ لاشیں یہاں لائی گئی ہیں۔ ہم نے تفضل کریم کے والدین کو فون لگایا۔ فون نہیں لگا اچھا ہوا آپ یہاں آگئے۔ یہ دیکھئے یہ ہے اُس کی لاش'' یہ کہہ کر فادر ایک لاش کی طرف آگے بڑھے۔

میں نے فادر کی بات سنی تو حیران رہ گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ ابھی کل تو وہ میرے ساتھ تھا میں نے فادر سے کہا: ''فادر آپ میرے ساتھ یہ کیا مذاق کررہے ہیں کل رات تک تو وہ میرے ساتھ تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ نہیں یہ غلط ہے۔ یہ اس کی لاش نہیں ہوسکتی۔''

فادر نے کہا: ''مائی چائلڈ یہ امتحان کا وقت ہے۔ صبر اور ضبط سے کام لیں، حوصلہ رکھیں۔ آپ خود اپنی آنکھوں سے اس کی لاش دیکھ لیں۔''

بے یقینی کے انداز میں، میں فادر کے ساتھ آگے بڑھا۔ چبوترے پر بالکل کنارے کی لاش کے قریب پہنچ کر فادر رک گئے۔ میں ان کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹائی اور جو کچھ میں نے دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ وہ تفضل کریم ہی تھا۔ سو فیصد وہی تھا۔ برف میں پڑے رہنے سے اس کا چہرہ ایک

دم سفید پڑ چکا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو، چہرے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ اس کا پورا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں نے ہذیانی انداز میں چیخ کر کہا: ”نہیں فادر یہ نہیں ہوسکتا۔ ابھی کل تک تو وہ زندہ تھا۔ ابھی کیسے مر گیا۔ وہ زندہ ہے، وہ زندہ ہے۔“ میں نے یہ جملے چلّا کر کئی بار کہے اور اُس کے جسم سے لپٹ گیا۔ سینے سے لگا کر اُسے زور زور سے بھینچنے لگا۔ میں نے اس کے پورے جسم کو اپنے سینے سے لگا کر اٹھا لیا اور اسے سینے سے لگائے ہوئے چبوترے پر گر گیا۔ اس کے سینے پر گھونسے مارتے ہوئے میں کہنے لگا: ”تو نہیں مر سکتا۔ تفضّل تو نہیں مر سکتا تو مر گیا تو تیری ماں بھی مر جائے گی۔“ یہ کہہ کر میں بے تحاشہ اس کے سینے پر مکّے مارنے لگا۔ تبھی ایک چمتکار ہوا۔ تفضّل کی سانس چلنے لگی۔ اس کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ فادر نے بھی یہ منظر دیکھا وہ دوڑ کر تفضّل کے پاس آئے۔ اس کی ناک کے پاس انگلی رکھی۔ واقعی اس کی سانس چل رہی تھی۔ ڈاکٹر وہاں موجود تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو اسٹیتھسکوپ سے تفضّل کے جسم کی جانچ کرنے لگا۔ فوراً اس نے جسم کو حرارت پہنچانے والے اور خون کو پتلا کرنے والی دوائیوں کے انجکشن اُسے دیئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد تفضّل پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ فوراً اُسے گرما گرم کافی پینے کے لئے دی گئی۔ گھنٹے بھر بعد وہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ سارے لوگ اس منظر کو دیکھ کر حیران تھے۔ جب وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا تو فادر نے اس سے کہا: ”مائی چائلڈ تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

تفضّل نے کہا: ”فادر مجھے اچھا محسوس ہو رہا ہے۔ ہاتھ پیر کے جوڑوں میں تھوڑا درد ہو رہا ہے۔“

ڈاکٹر نے کہا: ”بس تھوڑی دیر میں تم بالکل نارمل ہو جاؤ گے۔“

فادر نے ڈاکٹر سے پوچھا: ”ڈاکٹر یہ کیسے ہو گیا؟“

ڈاکٹر نے کہا: ''فادر یہ بچے جب اپنی کار میں بیٹھ کر پٹھان کوٹ کی طرف جا رہے تھے تو اس لڑکے نے سمور والے دو گرم کوٹ پہنے تھے۔ اس کا پورا چہرہ کنٹوپ سے ڈھکا ہوا تھا اور شاید یہ دوسرے بچوں کے نیچے دب گیا تھا اس لئے اس کے جسم پر برف کی پرت جمنے نہیں پائی۔ موسم کی ٹھنڈک کی وجہ سے اس کے جسم کی اوپری جلد کا خون منجمد ہو گیا جبکہ اندر دل میں اور رگوں میں خون جمنے نہیں پایا۔ وہاں خون مائع حالت میں موجود تھا۔ دل کی دھڑکن کسی سبب سے رک گئی تھی۔ ان صاحب کے لمس سے، مکّے مارنے سے لڑکے کا دل متحرک ہو گیا اور خون رگوں میں دوڑنے لگا۔ اوپری اور بیرونی سمت میں جما ہوا خون اس مائع خون کے دوران سے بہنے لگا اور لڑکا جاگ گیا۔ میں اسے اس طرح کہہ سکتا ہوں کہ لڑکا اپنی سرمائی نیند سے جاگ اٹھا ہے۔ جیسے کہ مینڈک گڑھوں کے اندر پڑے رہتے ہیں اور موسم تبدیل ہونے کے بعد سرمائی نیند سے جاگ جاتے ہیں۔''

فادر نے کہا: ''ڈاکٹر آپ کچھ بھی دلیل دیں میں تو صرف یہی کہوں گا کہ یہ تو گاڈ کا کرشمہ ہے۔''

ڈاکٹر نے کہا: ''یس فادر، واقعی یہ قدرت کا کرشمہ ہے۔''

سارے لوگ اس منظر کو حیرت سے دیکھ رہے تھے اور سارے لوگوں کو تفضّل تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ چبوترے پر دیگر چار لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ تب میں نے تفضّل کو مخاطب کر کے کہا: ''بیٹا یہ مڈل تم میرے پاس بھول آئے تھے۔ میں دہلی سے یہ تمہیں واپس کرنے یہاں آیا تھا۔''

اس نے مڈل اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا: ''ارے یہ مڈل آپ کے پاس کہاں سے آ گیا۔ یہ تو میں نے اپنے دادا جان کے پاس رکھوا دیا تھا اور ہاں آپ کون ہیں میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

فادر نے کہا: ''تفضّل تم نے انہیں پہچانا نہیں! انھیں کی وجہ سے تو تمہیں دوسری زندگی ملی ہے۔''

''دوسری زندگی؟ فادر میں سمجھا نہیں۔''

فادر نے کہا: ''وہ دیکھو تمہارے دوستوں کی لاشیں۔ روہتا نگ میں تمہاری کار کو حادثہ پیش آیا۔ تمہاری گاڑی نیچے کھائی میں گر گئی۔ تم سب لوگ برف میں دب گئے۔ دو روز پہلے تمہاری کار کا پتہ چلا اور وہاں سے تم پانچوں کی لاشیں یہاں لائی گئیں۔ ابھی یہ صاحب تم سے ملنے یہاں آئے تھے۔ تمہیں مردہ حالت میں دیکھ کر ان پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی اور تمہیں بے تحاشہ مارنے لگے بس اسی سے تمہاری جان واپس آ گئی۔ انہیں صاحب کی وجہ سے تم زندہ ہوئے ہو۔''

تفضّل نے کہا: ''لیکن میں انہیں نہیں جانتا۔ آج سے پہلے میں نے انہیں کبھی دیکھا بھی نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ میرا یہ اتنا قیمتی مڈل ان کے پاس کیسے پہنچ گیا۔''

میں نے اس کے منہ سے یہ باتیں سنیں تو حیران رہ گیا۔ میں نے اس سے کہا: ''کل تم میرٹھ میں اپنی پھوپھی کے گھر میں تھے اور یہ مڈل تم نے مجھے وہاں گاندھی باغ میں دیا تھا۔ رات کا کھانا تمہاری پھوپھی کے گھر میں ہم نے ساتھ ہی کھایا تھا۔ تم صبح پانچ بجے وہاں سے نکل گئے تھے۔ یہ مڈل میرے پاس رہ گیا تھا۔ وہی واپس کرنے میں یہاں آیا تھا اور تمہیں اس حال میں دیکھا اور ہاں پچھلے پندرہ دنوں سے میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

تفضّل نے کہا: ''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ پچھلے پندرہ دنوں سے آپ میرے ساتھ ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔''

فادر نے کہا: ''مسٹر، یہ تو پندرہ دنوں سے برف میں دبا پڑا تھا پھر آپ کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ ہوش میں تو ہیں؟ آپ یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا: ''فادر میں پوری طرح ہوش میں ہوں۔'' پھر میں تفضّل کی طرف مڑا اور اس سے کہا: ''تم پندرہ دن پہلے میرے گھر ناگپور آئے تھے کہ نہیں؟''

تفضّل نے حیرت سے کہا: ''ارے میں ناگپور کیوں جاؤں گا۔ میں نے ناگپور کا نام سنا ضرور ہے لیکن میں وہاں کیوں جاؤں گا۔''

''اچھا تمہیں یہ معلوم ہے کہ تمہارے دادا جان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور ان کے قتل کے اِلزام میں تمہارے والد مرزا فیصل کریم کو جیل میں بند کر دیا گیا ہے۔'' ان باتوں کو سن کر اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور برہمی کے انداز میں اس نے مجھ سے کہا: ''جناب آپ کون ہیں۔ بخدا میں آپ کو نہیں جانتا اور آپ یہ کیا بکواس کر رہے ہیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ میرا یہ مڈل آپ کے ہاتھ کیسے لگ گیا۔''

میں نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اُسے گذشتہ پندرہ دنوں کی کوئی بھی بات یاد نہیں ہے۔ اگر یہ پندرہ دنوں سے برف میں دبا ہوا تھا تو کیا وہ اس کی روح تھی جو ہمارے ساتھ رہ رہی تھی۔ کیا وہ اس کی روح تھی جسے میں اور اس کے گھر کے لوگ تفضّل سمجھ رہے تھے۔ کیا درحقیقت وہ تفضّل نہیں تھا اس کی روح تھی جو ایک مسیحا کی طرح اپنے گھر کے لوگوں کو اس کے باپ کے ظلم اور اذیتوں سے چھٹکارہ دلانے کے لئے ہمارے ساتھ رہ رہی تھی۔ میں نے تفضّل کو مخاطب کر کے کہا: ''بیٹا تفضّل جب تم یہاں سے دہلی اپنی کوٹھی میں جاؤ گے اور اپنی والدہ سے ملو گے تو تمہیں وہ ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی جو پچھلے پندرہ دنوں میں واقع ہو چکی ہیں اور جنھیں تم نہیں جانتے۔ تم فوراً اپنے گھر جاؤ۔ مجھے جو کرنا تھا وہ میں کر چکا۔ اب آگے تمہیں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی جن پر تم یقین نہیں کرو گے۔ لیکن وہ ساری باتیں سچ ہوں گی اچھا اب میں چلتا ہوں یہاں میرا کام ختم ہو گیا۔ بس ایک بات یاد رکھنا۔ میں ناگپور

سے دہلی تمہارے ساتھ آیا تھا اور میرا نام وکیل نجیب ہے۔" اتنا کہہ کر میں نے مڈل اس کے ہاتھ میں دے دیا اور وہاں سے واپس ناگپور چلا آیا۔

ناگپور آنے کے بعد میں نے سوٹ کیس میں سے وہ تھیلی نکالی جس میں ہیرے تھے۔ اس تھیلی کو میں نے اپنی الماری کے لاکر میں بند کر کے رکھ دیا۔ لیکن ان ہیروں کا خیال ہمیشہ میرے ذہن میں موجود رہتا تھا۔ میں اپنے آپ کو چور محسوس کرنے لگا تھا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا تھا کہ میں نے دھوکے سے دوسروں کی دولت چرالی، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایک عجیب طرح کی اضطرابی کیفیت اور بے چینی کی حالت میں میری زندگی گذر رہی تھی۔ اکثر راتوں کو میں سوتے سوتے جاگ جاتا تھا۔ اسی کیفیت میں ایک ہفتہ گذر گیا۔ ایک روز رات کو میں نیند سے جاگ پڑا تو بیگم بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ مجھ سے کہا: "کیا بات ہے تم جب سے دہلی سے آئے ہو بے چین رہتے ہو۔ نیند سے جاگ جاتے ہو اور ابھی ابھی تم چلا کر کہہ رہے تھے کہ میں چور نہیں ہوں۔ میں نے چوری نہیں کی، مجھے چھوڑ دو، مجھے معاف کر دو۔"

میں نے بیگم کے منہ سے یہ باتیں سنیں تو حیران ہوا پھر پریشان ہوا اور دہلی کی کوٹھی سے ہیرے چرانے کی بات انھیں بتادی۔

میری بات سن کر وہ حیران رہ گئیں اور انھوں نے غصیلے لہجے میں مجھ سے کہا: "مظلوم لوگوں کے گھر میں چوری کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔ تمہارے ضمیر نے تمہیں ملامت نہیں کی۔ آخر تم ایسی حرکت کرنے پر آمادہ کیسے ہو گئے؟"

میں نے کہا: "بس ایک لالچ کا جذبہ تھا جو مجھ پر حاوی ہو گیا اور میں وہ کر بیٹھا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں گذشتہ ایک ہفتے سے اپنے آپ کو چور سمجھ رہا ہوں ہمیشہ مجھ پر گھبراہٹ طاری رہتی ہے اور وہ ہیرے میرے دماغ سے کسی طرح نکل نہیں پار ہے

ہیں۔“

بیگم نے کہا: ”چلو مجھے وہ ہیرے دکھاؤ۔“

میں نے الماری کے لاکر سے نکال کر وہ ہیرے انھیں دکھائے۔ وہ کل پندرہ ہیرے تھے۔ کابلی چنے کے برابر ان کی جسامت تھی اور نہایت خوبصورتی سے تراشے ہوئے تھے۔ انھیں جس زاویے سے دیکھو تابناک نظر آتے تھے۔ بیگم نے ان ہیروں کو پھر سے تھیلی میں رکھ دیا اور مجھ سے کہا: ”کل کی ٹرین سے ہم دہلی جائیں گے اور جس کی امانت ہے انھیں لوٹا دیں گے۔“

میں نے کہا: ”ہاں جب تک یہ نہ ہوگا مجھے اس کرب اور ذہنی اذیت سے نجات نہیں ملے گی۔“

دوسرے دن دہلی جانے کا تہیہ کر کے ہم سو گئے۔ اگلی صبح، جبکہ میں ناشتے کے لئے بیٹھنے ہی والا تھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے دیکھا کہ دروازے پر تفضّل اپنی والدہ کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ انھیں دیکھ کر میں حیران ہوا، پھر انھیں اندر آنے کو کہا۔ وہ دونوں آ کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے آواز دے کر نعمل کے امی کو بھی وہاں بلوالیا۔ وہ آئیں تو میں نے انھیں بتایا کہ یہ تفضّل کے امی ہیں۔ انھیں دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔ تفضّل نے نعمل کے امی کو سلام کیا۔ نعمل کے امّی بھی وہیں بیٹھ گئیں اور تفضّل سے کہا: ”کہو بیٹے کیسے ہو؟“

”جی اچھا ہوں۔“

”تمہیں یاد ہے تم یہاں پہلے بھی آ چکے ہو؟“

”جی نہیں مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ پھر وہ تفضّل کے امی کی طرف مڑیں اور ان سے کہا: ”آپا سنایئے کیسے ہیں آپ لوگ؟“

''ہم لوگ اچھے ہیں، سارے معاملات سلجھ چکے ہیں۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔''

میں نے کہا: ''اور آپ کے بھائی عظیم الدین کا کیا حال ہے؟''

''اُس نے اس دن مار کھائی تو اس کے بعد گھر ہی نہیں آیا۔ میں نے اس کے خلاف کورٹ میں کیس داخل کر دیا ہے۔ اس کے بیوی بچے کوٹھی میں ہی رہ رہے ہیں۔''

''آپا اب ان کو آپ کا ہی سہارا ہے۔ وہاں کے لوگ بھی اس کو زیادہ دن اپنے ساتھ نہیں رکھیں گے۔ سب کچھ اُس نے اپنی دوسری بیوی کے نام کر دیا ہے۔ آخر کو وہ آپ کی ہی چوکھٹ پر آئے گا۔ اپنی سگی بہن کے ساتھ بڑی غداری کی اس نے۔''

''اب بھائی صاحب جو ہونا تھا سو ہو چکا اور اچھا ہوا ہمیں جلدی پتہ بھی چل گیا۔ آگے دیکھیں گے کیا حالات پیش آتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''اچھا ہے آپا برائی کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔''

نعمل کے امّی کے ساتھ تفضّل کے امی اٹھ کر اندر کے کمرے میں چلی گئیں۔ تفضّل وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اس سے کہا: ''اور سناؤ تفضّل صاحب پڑھائی وغیرہ کیسی چل رہی ہے۔''

تفضّل نے کہا: ''میں اسکول سے کوٹھی پر آ گیا۔ وہ ساری باتیں مجھے معلوم ہوئیں جو مجھے آپ نے اسکول میں بتائی تھیں۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لئے میں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی۔ امی نے کہا کہ آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے اس لئے زیدی صاحب سے پتہ لے کر ہم یہاں آ گئے۔''

''چلو اچھا ہوا۔ تم سے پھر سے مل کر اچھا لگ رہا ہے۔ کونسی ٹرین سے آئے ہو؟''

''جی ہم لوگ ہوائی جہاز سے آئے ہیں اور کل شام کا ہمارا واپسی کا ٹکٹ بنا ہوا

ہے۔"

"اچھا! چلو ٹھیک ہے۔ ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔"

تفضّل نے کہا: "جی انکل بہتر ہے۔"

میں نے نعمل کو آواز دی۔ وہ آیا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ اُسے اندر لے جائے۔ تفضّل نعمل کے ساتھ اندر کے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے تفضّل میں کافی تبدیلیاں محسوس ہو رہی تھیں۔ میرے لئے میرے کمرے میں ناشتہ آ گیا۔ میں نے ناشتہ کر لیا اور اپنے اسکول روانہ ہو گیا۔ جانے سے پہلے میں نے تفضّل کی والدہ سے کہا: "آپا آپ یہاں اطمینان سے رہیں۔ کسی قسم کا تکلف نہ کریں۔ میں اسکول سے جا کر آتا ہوں۔"

انھوں نے کہا: "جی بھائی صاحب بہتر ہے آپ جایئے میں یہاں ہوں۔ میری فکر نہ کریں۔"

میں نے اپنی بیٹی قیصر سے کہا: "قیصر دیکھ پھوپھی کا خیال رکھنا اور تایا امی سے اور تیری چچی سے بھی ان کی ملاقات کروالانا۔ میں اسکول سے آتا ہوں۔" اتنا کہہ کر میں وہاں سے نکل گیا۔

شام کو گھر پہنچا تو وہ لوگ بازار گئے ہوئے تھے۔ گھر میں صرف نعمل موجود تھا۔ میں بیٹھک کے کمرے میں بیٹھ گیا اور اخبار دیکھنے لگا۔ مغرب سے تھوڑا قبل وہ لوگ گھر آ گئے۔ تفضّل کی والدہ نعمل کی والدہ سے گھل مل گئی تھیں۔ مغرب بعد میں نے تفضّل کو ساتھ لیا اور ڈاکٹر شرف الدین ساحؔل صاحب کی دکان میں چلا آیا۔ وہ اس وقت دکان میں موجود تھے۔ انھوں نے اُسے دیکھا تو فوراً بول اٹھے: "کیا بے مجھے پہچانا کہ نہیں؟"

تفضّل نے کہا: "جی نجیب انکل نے بتایا ہے کہ آپ ڈاکٹر شرف الدین ساحؔل صاحب ہیں۔ میرے لئے آپ نے بھی کافی محنت کی تھی۔"

''ابے تجھے معلوم نہیں پانچ رات جاگ جاگ کر تیرے دادا کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ تب کہیں جا کر اس جگہ کا پتہ چل پایا جہاں تیرے دادا نے زیورات چھپا کر رکھے تھے۔ بڑا ہی مشکل کام تھا۔''

''جی مجھے نجیب انکل سب کچھ بتا چکے ہیں۔ آپ دونوں کا مجھ پر اور میری والدہ پر بڑا احسان ہے۔''

پھر انھوں نے کہا: ''اور ابھی کیا کر رہا ہے؟ اسکول جا رہا ہے کہ نہیں؟''

''انکل میں نے اسکول سے چھٹی لی ہوئی ہے۔ امی کہتی ہیں کہ جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے تب اسکول جانا۔ آپ لوگوں نے ہمارے لئے بڑی محنت کی۔ بہت وقت دیا۔ آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنے چلے آئے۔''

''بیٹا، یہ وکیل نجیب صاحب ہیں نا، بس ان کا شکریہ ادا کرو۔ دوسرا کوئی ہوتا تو تمہارے لئے اتنا کچھ نہ کر پاتا۔ خیر وہ ساری باتیں تم نہیں جانتے۔ یہ زندگی بھی تمہیں انھیں کی وجہ سے ملی ہے۔''

''جی مجھے معلوم ہے۔ اسکول کے دوستوں نے اور فادر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم وہاں سے اُٹھ کر گھر میں آ گئے۔ ہمارے رشتے داروں کو اس لڑکے تفضّل کے متعلق معلوم ہوا تو سارے لوگ اُسے دیکھنے اور اس سے ملاقات کرنے آنے لگے۔ دوسرے دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

دوسرے دن شام کے سات بجے کی ان کے جہاز کی پرواز تھی۔ بیگم کے کہنے پر میں نے ہیروں کی وہ تھیلی جو میں کوٹھی سے اٹھا لایا تھا، ایک پلاسٹک کے ٹفن میں رکھ دی اور اسے چاروں طرف سے برفی کے ٹکروں سے دبا دیا۔ اوپر ایک چٹھی رکھ دی جس میں ہیرے ملنے اور اُسے اپنے ساتھ ناگپور لے آنے کا ذکر کیا تھا۔ ساتھ ہی اس برے کام

کے لئے میں نے ان سے معافی بھی مانگی تھی۔ یہ ٹفن میں نے ایک چھوٹے سے بیگ میں اپنے ساتھ رکھ لیا۔ پانچ بجے تیار ہو کر ہم نکلے، ہم نے ایک ٹیکسی لے لی۔ جس میں بیگم، مَیں، تفضّل اور اس کی والدہ ہم چاروں لوگ بیٹھ گئے، ٹیکسی ایئر پورٹ کی سمت روانہ ہوگئی اور تھوڑی دیر میں ہم ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ پر ان کی ٹکٹوں کی چیکنگ ہوگئی، تھوری دیر بعد دہلی جانے والے مسافروں کو رن وے کی طرف آنے کے لئے کہا گیا۔ وہ لوگ رن وے کی طرف بڑھنے لگے تب بیگم نے پلاسٹک کی تھیلی میں سے وہ ٹفن نکالا جس میں ہیروں کی تھیلی رکھی ہوئی تھی اور تفضّل کی والدہ کے ہاتھ میں دے کر کہا: ''آپا، اس میں آپ لوگوں کے لئے کچھ مٹھائی ہے اور ایک چٹھی بھی ہے اسے دہلی پہنچ کر دیکھنا۔'' انھوں نے شکریہ کے ساتھ ٹفن لے لیا اور اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا اور ہم سے کہا: ''آپ لوگوں کی مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ آپ لوگ بھی دہلی آئیں اور یہ نہ سمجھیں کہ یہاں سے ہمارے تعلقات ختم ہوگئے بلکہ یہ تو تعلقات پختہ ہونے کا آغاز ہے۔''

بیگم نے کہا: ''جی ہاں ہم جلد ہی دہلی آئیں گے۔'' اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ تفضّل اپنے امی کے ساتھ چند قدم آگے بڑھا اور پھر تیزی سے واپس آیا اور آکر مجھ سے لپٹ گیا۔ رونے لگا اور کہا: ''انکل آپ نے میرے امی کو بہت بڑے عذاب سے چھٹکارا دلایا ہے۔ آستین کے سانپ میرے ماموں سے آپ نے ہمیں نجات دلائی ہے۔ میں نے اپنے ہی گھر میں اپنے امی کو جانوروں کی طرح مار کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ سسک سسک کر اور تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں زندگی بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔''

میں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور اس سے کہا: ''بیٹا یہ جو کام ہوا ہے اُسے میں نے انجام نہیں دیا ہے۔ وہ اوپر بیٹھا ہے نیلی چھتری والا۔ دکھوں سے نجات دلانے کے

اسباب وہی پیدا کرتا ہے۔ مجھے تو اس نے ایک ذریعہ بنایا یہ سارا کرشمہ اُسی کا ہے۔ اس کے دربار میں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔'' پھر میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ لے جا کر اس کے امی کے ساتھ کر دیا۔ دونوں نے نم آنکھوں سے ہمیں خدا حافظ کہا اور ہوائی اڈے کی مرکزی عمارت میں داخل ہو گئے۔

ہم وہیں ویٹنگ روم میں بیٹھے رہے۔ پندرہ منٹ بعد جہاز کے روانہ ہونے کا اعلان ہوا۔ ہم ویٹنگ روم سے نکل کر باہر پارکنگ کی طرف آئے۔ تبھی جہاز ہمارے سروں پر سے اڑ کر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے جہاز کی طرف ہاتھ اٹھا کر اسے الوداع کہا۔ ہماری ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم اس میں جا کر بیٹھ گئے اور ہماری ٹیکسی واپسی کے لئے مڑی۔ تھوڑی دور آنے کے بعد میں نے بیگم سے کہا: ''بیگم میں نے تم کو ایک بات تو بتائی ہی نہیں۔''

انہوں نے پوچھا: ''کیا؟''

میں نے کہا: ''تفضّل جب پہلی بار ہمارے گھر آیا تھا تو اس نے خدا کو حاضر ناظر جان کر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر دولت زیادہ ملی تو وہ مجھے اس میں سے دس فیصد حصہ دے گا کہ میں اسے تلاش کرنے میں پیسے بھی خرچ کر رہا تھا اور محنت بھی کر رہا تھا۔''

بیگم نے کہا: ''تو کیا یہ کام تم دس فیصد کمیشن کے لالچ میں کر رہے تھے؟''

میں نے کہا: ''نہیں، لیکن جب میں نے دیکھا کہ اتنی بڑی دولت ملنے کے بعد بھی انھوں نے مجھے کچھ نہیں دیا تو میں وہ ہیرے اُٹھا کر لے آیا تھا۔''

بیگم نے کہا: ''وہ بات تو تفضّل کی روح نے تم سے کہی تھی انھیں کیسے پتہ چلتا اور تم نے ایک غلط کام کر لیا تھا اللہ نے ہمیں اُسے درست کرنے کا ایک موقع دے دیا اور اب اس پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس بات کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جس کی ملکیت تھی، جس کی امانت تھی اس تک پہنچ گئی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر

ہے۔" اسی طرح باتیں کرتے کرتے ہماری ٹیکسی گھر کے سامنے پہنچ گئی۔ ہم ٹیکسی سے نکل کر گھر میں داخل ہوئے۔ بیگم کچن میں چلی گئیں اور میں ڈرائنگ روم میں بچھے دیوان پر لیٹ گیا جس پر تفضل کی والدہ سویا کرتی تھیں۔ پھر میں نے بیگم سے کہا:
"بیگم ذرا چائے بناؤ بڑی تکان محسوس ہو رہی ہے۔"

انھوں نے کمرے میں آ کر کہا: "ٹھیک ہے میں چائے بناتی ہوں تم پہلے ذرا اس دیوان پر سے اٹھو اس کی چادر اور تکیے مجھے دیوان کے باکس میں رکھنے ہیں۔"

میں دیوان پر سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیگم نے تکیے اٹھائے اور چادر اُٹھائی تو ہم یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ وہاں سرخ رنگ کی ویسی ہی ایک تھیلی رکھی ہوئی تھی جیسی تھیلی میں ہم نے ہیرے واپس کئے تھے، ہم دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ میں نے اُٹھ کر وہ تھیلی اٹھالی اور اسے چھو کر دیکھا۔ اس میں ہیرے موجود تھے۔ میں نے جلدی سے تھیلی کا منہ کھولا۔ اسے ہتھیلی پر الٹ کر دیکھا۔ ہیرے میری ہتھیلی پر جمع ہو گئے جھلملانے لگے ایک چٹھی بھی تھیلی سے نکل کر میری ہتھیلی پر آ گئی میں نے جلدی سے چٹھی کھولی اور اُسے پڑھنے لگا۔ چٹھی تفضل کی والدہ نے لکھی تھی۔ اس میں لکھا تھا: "بھائی صاحب آپ نے ہمارے ساتھ جو کیا وہ بہت سے اپنے بھی نہیں کر پاتے۔ اس کا اجر تو اللہ آپ کو دے گا اور یہ احسان تو زندگی بھر ہم پر رہے گا میرے بیٹے نے ناگپور سے آنے کے بعد مجھ سے کہا تھا کہ اس نے آپ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر کوئی بڑی دولت ہاتھ لگی تو وہ اس میں سے دس فیصد حصہ آپ کو بھی دے گا۔ گذشتہ دنوں حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہوئے کہ اس سلسلے میں سوچنے اور بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب جبکہ سارے حالات درست ہو گئے ہیں تو میں اپنے بیٹے کے کئے گئے وعدے کے مطابق یہ ایک چھوٹا سا تحفہ آپ کے لئے چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ اسے قبول کریں۔ یہ دس فیصد حصہ نہیں ہے بلکہ میری جانب سے آپ کی اہلیہ کے لئے

ایک حقیر سا تحفہ ہے اور ایسا نہ سمجھئے گا کہ ہمارے تعلقات یہاں ختم ہو گئے۔ یہ بدستور جاری رہیں گے۔ آپ کو اس دوران دہلی میں جو تکالیف اٹھانی پڑی ہیں میں اس کے لئے دل کی گہرائیوں سے معافی کی خواستگار ہوں۔ آپ کی بہن۔

عِفت سُمن آراء، مٹیا محل، دہلی

ہم دونوں تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے رہے۔ پھر میں نے ہیروں کو گنا۔ پندرہ ہیرے تھے۔ میں نے بیگم سے کہا: ''یہ ہیرے تو ہمارا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ گھوم کر پھر سے ہمارے ہاتھ آ گئے۔''

انھوں نے کہا: ''اب یہ جائز طریقے سے ہمارے گھر میں آئے ہیں انہیں گھر میں رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔'' اتنا کہہ کر انھوں نے ہیروں کی تھیلی میرے ہاتھ سے لے لی اور مجھ سے کہا: ''رکو میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ اندر کمرے میں چلی گئیں اور میں قدرت کے اس کرشمہ پر انگشت بدنداں بیٹھا ہوا تھا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے میرے قریبی دوست محمد حسین عارف، نیاز ملاّ خیر آبادی اور ظہیر پہلوان کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں نے ان سے کہا: ''ارے، آؤ، اندر آؤ۔''

نیاز ملاّ خیر آبادی صاحب نے مجھ سے کہا: '' گجرات اور بمبئی سے دو مولانا حضرات آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ نیچے کھڑے ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا: ''بلوا لو اُن کو۔''

وہیں گیلری سے آواز دے کر انھوں نے دونوں حضرات کو اوپر بلوا لیا۔ ہم لوگ کمرے میں بیٹھ گئے۔ تب ایک بزرگ اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور تقریر کے انداز میں انھوں نے اس طرح اپنی بات شروع کی: ''میں مولوی غیور الحسن ہوں احمد آباد سے آیا ہوں اور یہ میرے ساتھی مولانا ابوالقاسم انصاری صاحب ہیں۔ بمبئی سے میرے ساتھ

آئے ہیں۔ اخبار کے ذریعے اور ٹی وی کے نیوز چینلوں کے ذریعے آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہوگا کہ گجرات میں کیسا بدترین فساد ہوا ہے بلکہ ایک طرح سے حکومت کی سرپرستی میں منظم طریقے سے مسلمانوں کا قتل عام ہوا ہے۔ عورتوں اور بچوں کو بھی بے دردی سے قتل کیا گیا۔ حاملہ عورتوں کے شکم چاک کر کے بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا ہے۔ چاروں طرف سے گھیر کر لوگوں کو گھروں میں بند کر کے آگ لگائی گئی۔ مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ جو لوگ جان بچا کر بھاگ رہے تھے انہیں پکڑ پکڑ کر مارا گیا۔ فسادیوں کے ہاتھوں سے کوئی بچ جاتا تھا تو پولیس والے اُسے مار ڈالتے تھے۔ سرکار کی طرف سے اس کام کی انہیں کھلی اجازت ملی ہوئی تھی۔ ہزاروں لوگ مارے گئے۔ مسلمانوں کی دکانیں اور گھر جلا کر خاک کر دیئے گئے۔ مسجدوں اور قبرستانوں کی بے حرمتی کی گئی۔ بزرگوں کے مزارات کو نقصان پہنچایا گیا۔ نامور لوگوں کے مزارات کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ آج ہزاروں لوگ کیمپوں میں بے یار و مددگار پڑے بے بسی کی زندگی جی رہے ہیں۔ کسمپرسی کے ماحول میں دن گذار رہے ہیں۔ جو لڑکیاں اور عورتیں بے پردہ گھروں سے باہر نہیں نکلتی تھیں کیمپوں میں بے پردہ رہنے پر مجبور ہیں اور اپنے دینی بھائیوں سے مدد کی آس لگائے بیٹھی ہیں۔ ان بے سہارا لوگوں کے لئے تنظیم کی طرف سے مدد پہنچانے کا کام شروع کیا گیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہر دینی بھائی اپنی حیثیت کے مطابق مدد کر رہا ہے۔ اسی سلسلے میں ہم آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوئے ہیں۔ مظلوموں کی مدد کیجئے کہ یہی کام اس وقت، وقت کا سب سے بڑا کارِ ثواب ہے۔" اتنا کہہ کر وہ اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ہم سب لوگ ایک دوسرے کی صورت دیکھتے بیٹھے ہوئے تھے تبھی اندر سے بیگم نے مجھے آواز دی۔ میں اندر گیا۔ انھوں نے ہیروں کی وہ تھیلی میرے ہاتھ میں دی اور مجھ سے کہا: "یہ مولوی صاحب کو دے دو۔ اس کی ضرورت ہم سے زیادہ فساد میں برباد شدہ ہمارے دینی بھائی بہنوں کو ہے۔"

میں وہ تھیلی لے کر بیٹھک کے کمرے میں آیا اور تھیلی مولوی صاحب کے حوالے کی ساتھ ہی گیارہ سو روپے نقد بھی انہیں دیئے۔ انھوں نے اس کی رسید بنا کر مجھے دی اور میرا شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد چائے کی پیالی لے کر بیگم کمرے میں آئیں چائے میرے ہاتھ میں دی اور میری طرف دیکھ کر کہا: "حَسْبُنَا اللّٰهِ وَ نِعْمَ الْوَكِيْل"

میں نے کہا: "یقیناً اللہ سب سے بڑا کارساز ہے اور مسبب الاسباب بھی ہے۔" میرے منہ سے یہ کلمات سن کر انھوں نے کہا۔ "ہاں دیکھو نا کہاں کی چیز کہاں پہنچا دی۔" اتنا کہہ کر بیگم اندر کمرے میں چلی گئیں اور میں دیر تک بیٹھا اِس بہترین حکمتِ خداوندی پر غور کرتا رہا۔

﴿ختم شد﴾
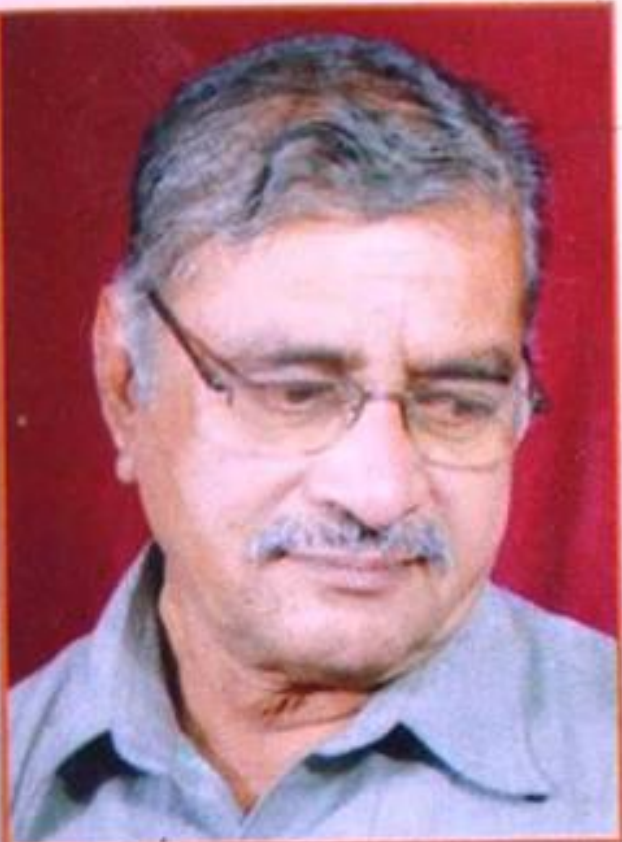
بچوں کے ادب میں بچوں کی ناول نگاری کرنے والے جو نام نمایاں ہیں ان میں کرشن چندر اور سراج انور سب سے نمایا ہیں۔ پچاس برس گزر گئے لیکن ماہنامہ کھلونا دہلی میں پڑھے ہوئے ان کے ناول آج تک ذہن و دل سے چپکے ہوئے ہیں یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوتی ہے اور احساس فخر بھی کہ کم وبیش یہی وصف اور اعزاز ہمارے اور آپ کے دور میں جناب وکیل نجیب کو بھی حاصل ہے۔

وکیل نجیب ۔۔۔۔ اکیسویں صدی کے اردو ادب اطفال کا سب سے زیادہ معروف، مقبول اور محترم نام ہے۔ ''بے زبان ساتھی''، ''مہربان جن'' اور ''خوفناق حویلی'' سے انہوں نے بچوں کی ناول نگاری کا آغاز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بچوں کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک پندرہ سولہ ناول لکھ ڈالے۔ ان میں کمپیوٹان سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا ناول ہے۔

سائنسی شعور اور سماجی حقیقت نگاری وکیل نجیب کے ناولوں کی واضح خصوصیت ہے اور اظہار واقعہ یعنی بیانیہ پر انہیں قدرت حاصل ہے وہ کہانی کو اس طرح بڑھاتے ہیں کہ پڑھنے والا اسی میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ تحیر، تجسس اور دلچسپی ان کی ناول نگاری کے نمایاں اوصاف ہیں۔ زبان صاف اور سادہ، انداز بیاں دلچسپ و دل نشیں، ساتھ ہی وہ گرد و پیش پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور اسے اس طرح سے اپنی کہانی میں سمو لیتے ہیں کہ قاری حیران بھی ہوتا ہے اور مسرور محظوظ بھی، ''مسیحا'' بظاہر ایک معمولی کہانی ہے مگر وکیل نجیب نے اپنے مخصوص انداز نگارش اور اسلوب وادا سے اسے غیر معمولی بنا دیا ہے۔ اس ناول کو بچے ہی نہیں، بڑے بھی ذوق و شوق سے پڑھیں گے۔
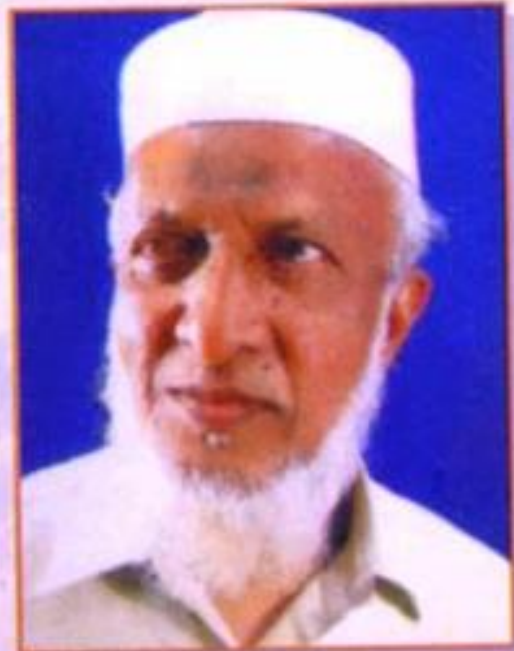
جناب عبدالرحیم نشتر

عبدالرحیم نشتر

۲۳ رفروری ۲۰۱۳ء، ناگپور